عمیرہ احمد

آبِ حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سرا مل جاتا ہے۔
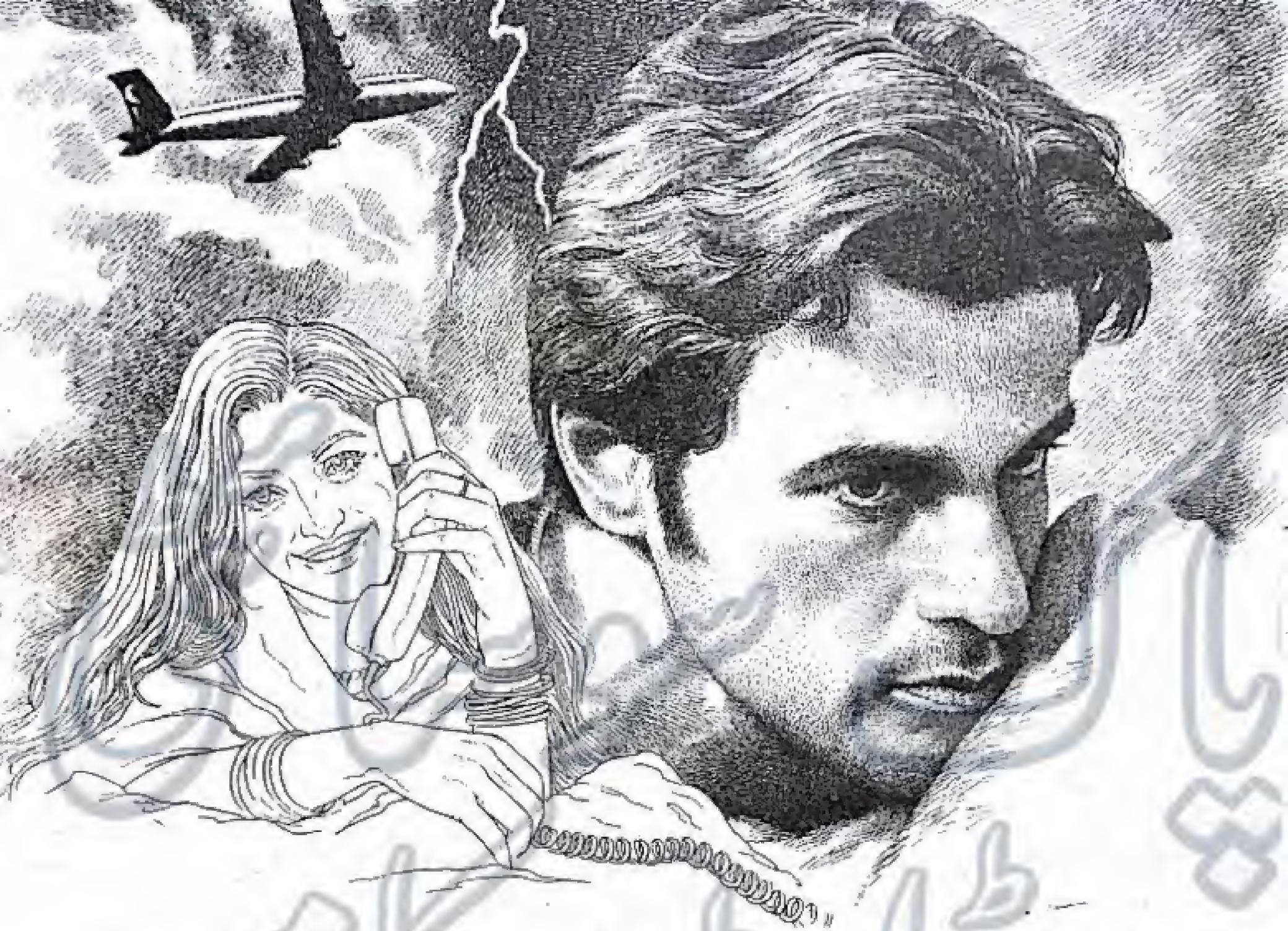
J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی نیلی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ نینسی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے، مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی، اس نے اس بار بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

بارہویں قسط

حاصل و محصول

کھڑکی سے سالار نے واشنگٹن میں ڈوبتے ہوئے سورج پر ایک آخری نظر ڈالی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی نارنجی شعاعیں جہاز کے دودھیا پروں کو بھی ایک روپہلا رنگ دے رہی تھیں۔ جہاز اب ہزاروں فٹ کی بلندی پر تھا۔ ہوا میں معلق... نہ آسمان پر نہ زمین پر اور یہی کیفیت سالار سکندر کی بھی تھی۔

واشنگٹن ایئرپورٹ سے اس چارٹرڈ طیارے نے کچھ دیر پہلے کنشاسا کے لیے ٹیک آف کیا تھا جہاز میں عملے کے افراد کے علاوہ صرف دو اور افراد تھے جو اس کا اسٹاف تھا۔ 37 سال کی عمر میں وہ ورلڈ بینک کا کم عمر ترین وائس پریذیڈنٹ تھا اور اس کی تعیناتی چار دن پہلے ہوئی تھی۔

ورلڈ بینک کے بورڈ آف گورنرز کے ایک ہنگامی اجلاس نے متفقہ طور پر اسے افریقہ کے لیے ورلڈ بینک کا نیا نائب صدر... نیا چہرہ... چنا تھا۔ یہ عہدہ ورلڈ بینک کی تاریخ میں پہلی بار کسی غیر افریقی کو دیا گیا تھا اور دینے کی وجوہات ساری دنیا کے سامنے تھیں۔ سالار کی زندگی میں وہ "صدیوں جیسے چند دن" نہ آئے ہوتے تو وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا۔ اپنے اس "حاصل" پر فخر کرتا۔ اسے کامیابی کی انتہا محسوس کرتا... آگے کے مقاصد نئے سرے سے طے کرتا... اپنی امنگوں کا دائرہ بڑھا دیتا... نئے مقاصد... ترقی کی بھوک اور بڑھتی... ناموری کی خواہش سرکنڈوں کی رفتار سے بڑھتی... اس کا طرز زندگی پہلے دن سے یہی رہا تھا۔ دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں نے اسے یہی پڑھایا تھا۔ دنیا کی بہترین کمپنیز اور آرگنائزیشنز میں کام کرنے کے تجربے نے اسے یہی سکھایا تھا۔ آگے بڑھتے جانا، کامیابی کی شاہراہ پر آگے بڑھتے جانا۔ ایک کامیابی کی اینٹ پر دوسری کامیابی کی اینٹ رکھنا۔ اس سے بڑی کامیابی کی اور زینہ بناتے جانا... آگے... آگے... اور آگے... اوپر... اوپر... سب سے اوپر... ترقی... اور ترقی... اتنی ترقی کہ انسان صرف سی وی میں درج فتوحات اور کامیابیوں سے پہچانا جائے۔ کسی معمولی انسان کی طرح شناختی کارڈ میں لکھے نام، ولدیت اور ایڈریس سے نہیں...

وہ بھی ایسا ہی تھا۔ دین کی طرف رغبت رکھنے کے باوجود دنیا کی ہوس سے پیچھا نہ چھڑانے کی اہلیت رکھنے والا... وہ بھی ناموری چاہتا تھا... نہ ماننے کے باوجود بے پناہ عروج اور کامیابی کا کیڑا اس کے وجود کو بھی گھن کی طرح لگا ہوا تھا مگر اس کو کبھی دیکھا نہیں تھا کیوں کہ کیڑے نے اس کے وجود کو کھوکھلا کر کے ابھی اسے منہ کے بل گرایا نہیں تھا۔

اور ان چند دنوں نے زندگی میں پہلی بار سالار سکندر کو بیٹھ کر سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ وہ زندگی میں چاہتا کیا تھا۔ پہلے امامہ تھی جس کا نہ ملنا اس کے وجود کو ٹیس زدہ کیے رکھتا تھا۔ اس کو لگتا تھا وہ بے کلی، بے قراری صرف محبت کے نہ ملنے کی وجہ سے ہے۔ وہ خالی ہاتھ اور خالی دل تھا اس لیے تکلیف میں تھا، لیکن اب کیا تھا جو زندگی میں بے سکونی کے اس پودے کو بنجر نہیں ہونے دے رہا تھا جو پتا نہیں کس مقام پر اس کے وجود کے اندر اگ آیا تھا۔

سب کچھ جو پاس تھا... خاک تھا۔ جو مٹھی میں تھا... ریت تھا۔ جو نظر میں تھا، فریب تھا... اور ان سب کے بیچوں بیچ وہ شخص... دنیا کے ذہین ترین انسانوں میں سے ایک... بہترین مذہب کی پیروی کرنے والا... آخری آسمانی کتاب کا حافظ... ترقی اور کامیابی کے مینار پر کھڑا خود کو ویسے ہی معلق محسوس کر رہا تھا جیسے وہ جہاز جس میں وہ اس وقت بیٹھا، وہاں جا رہا تھا جہاں سے مغربی دنیا کے تمام ممالک اپنے اپنے شہریوں کو نکال چکے تھے۔

چار دن پہلے اس رات اس ہوٹل کے کمرے میں امامہ کی کال نہیں آئی تھی۔ پھر اس کے بعد میسجز، کالز کا سیلاب آگیا تھا۔ چند گھنٹوں میں اسی ہوٹل میں ایک ڈیلکس کمرے سے اسے رائل سویٹ میں منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بہترین سیکورٹی دی گئی تھی۔ کیوں کہ اس کی "زندگی" کو "خطرہ" تھا۔

امریکا کا ہر چھوٹا بڑا چینل اس وقت یہی ایک خبر بریکنگ نیوز کے طور پر چلا رہا تھا کہ سالار سکندر کی زندگی خطرے میں تھی اور وہ غائب کیوں تھا؟ وہ اس ساری صورت حال کے بارے میں کوئی بیان کیوں نہیں دے رہا تھا؟ پیٹرس ایباکا کے بارے میں کیوں خاموش تھا؟ ورلڈ بینک کی اس رپورٹ اور پروجیکٹ کے بارے میں کیوں کچھ نہیں کہہ رہا تھا' جو متنازعہ تھا؟

اور سالار سکندر چینلز پر چلنے والی ان بریکنگ نیوز اور الرٹس کے درمیان ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر میں ورلڈ بینک کے صدر سے ملاقات کے لیے تیاری کر رہا تھا جو ورلڈ بینک کے صدر کی درخواست پر ہو رہی تھی۔ وہ ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹرز سے ورلڈ بینک کے صدر سے ملاقات کی بھیک مانگتے مانگتے "کتا" بن کر وہاں سے نکلا تھا اور اب اسی صدر کی منت بھری درخواست پر وہاں صدر کے ذاتی استعمال میں آنے والی کاروں میں سے ایک' شوفر سمیت لیموزین میں بادشاہوں کی طرح سیکورٹی اور پروٹوکول کے ساتھ وہاں بلایا جا رہا تھا۔

وہ زندگی میں پہلی بار کسی لیموزین میں بیٹھا تھا نہ زندگی میں پہلی بار سیکورٹی اور پروٹوکول کے "لوازمات" چکھ رہا تھا' مگر زندگی میں میں پہلی بار اسے اس گھٹن کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جو اس کے سینے کو پنجرے میں قید پرندہ کر رہی تھی۔۔۔ بے بس۔۔۔ پھڑپھڑاتا۔۔۔ قید میں آزادی کے لیے بے قرار۔۔۔ آسمان کی کھلی فضا کو حسرت سے دیکھتا۔۔۔ دل تھا کہ لگتا تھا بند ہو کر ہی دم لے گا۔۔۔ سانس تھا کہ بند ہونے کے لیے مچلتا پھر رہا تھا اور وہ اس کیفیت اور حالت میں ورلڈ بینک کے صدر سے ملنے جا رہا تھا جب کہ وہ وہاں کبھی دوبارہ تھوکنے کے لیے بھی نہیں آنا چاہتا تھا۔

ہیڈ کوارٹر کے باہر پریس موجود تھا' اپنے مشین گنوں جیسے کیمروں اور مائکس کے ساتھ۔۔۔ بجلی کی طرح فلیش لائٹس کے جھماکوں کی تیاری اور انتظامات کے ساتھ۔۔۔ انہیں اطلاع کس نے دی تھی؟ اس کے اس دن وہاں آنے کی؟

یہ سالار سکندر کے لیے کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔۔۔ وہ سرکس کا وہ جانور تھا جسے بینک اور سی آئی اے اب نچا کر تماشا لوٹنا چاہتے تھے اور سرکس کا جانور اس لیموزین سے فلیش لائٹس اور سوالوں کے نعروں کے درمیان اترتے ہوئے اپنی اگلی حکمت عملی ترتیب دے رہا تھا۔۔۔ اسے اگر ناچنا ہی تھا تو اپنی شرطوں پر۔۔۔ پتلی بننا تھا تو شرائط کسی کی انگلی کی نہیں۔

وہ لیموزین سے اتر کر اپنے کھلے کوٹ کے بٹن بند کرتا' فلیش لائٹس کے جھماکوں سے کچھ فاصلے پر ڈرائیو وے کے دونوں اطراف میں لگی ہوئی وارننگ ٹیپ کے پار کیمرہ مینوں اور جرنلسٹس کی بھیڑ کی طرف ایک نظر بھی ڈالے بغیر عملے کے ان افراد کی رہنمائی میں لمبے لمبے قدموں کے ساتھ اندر چلا گیا تھا۔ جنہوں نے کار سے اترنے پر اس کا استقبال کیا تھا۔

کچھ نئے لوگوں کے علاوہ بورڈ روم میں وہ سب لوگ موجود تھے جن سے وہ کچھ دن پہلے بھی ملا تھا۔۔۔ لیکن اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ جیسے اس کا باطن ویسے ہی ان لوگوں کا ظاہر۔۔۔

اس کا استقبال بورڈ روم میں ایک ہیرو کے طور پر تالیاں بجا کر خیر مقدمی نعروں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ یوں جیسے وہ کوئی ہیرو تھا جو جنگ جیت کر کسی بادشاہ کے دربار میں اپنی خدمات کے بدلے میں کوئی بڑا اعزاز لینے آیا تھا۔ ان سب کے چہروں پر مسکراہٹیں اور نرمی تھی۔ آنکھوں میں ستائش اور ہونٹوں پر داد و تحسین۔۔۔ گرم جوشی سے مصافحہ اور معانقے کرتے ہوئے سالار سکندر صرف یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ "کھر" کے "ڈکیا" آیا تھا جس کے لیے ایسا استقبال کیا گیا تھا۔ وہ ان ہی لوگوں کے ساتھ اس بیضوی شکل کی میز پر پریذیڈنٹ کی سیٹ کے داہنی جانب پہلی نشست پر بٹھایا گیا تھا جن کی گردن کا سریا اور لہجوں کی رعونت نے اس کی عزت نفس کی دھجیاں اڑائی تھیں۔

انسان کی سب سے بڑی خاصیت یہی ہے کہ وہ بھولتا نہیں ہے نہ برائی نہ اچھائی۔۔۔ نہ کم ظرفی نہ ایثار۔۔۔ نہ بے

مہری نہ احسان۔۔۔ نہ عزت نہ ذلت۔۔۔ سالار سکندر بھی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ایک "انسان" تھا جو کچھ ہو چکا تھا' وہ پتھر پر لکیر تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا' وہ پانی کی پھوار تھا۔
اس کی آمد کے ٹھیک پانچ منٹ بعد ورلڈ بینک کا صدر بورڈ روم میں آگیا تھا۔ سالار سکندر بھی باقی سب کی طرح اس کے احترام اور استقبال کے لیے کھڑا ہوا تھا۔
"ورلڈ بینک کو آپ پر فخر ہے۔" اس کے ساتھ ہی استقبالی کلمات کی ادائی کے بعد صدر کے منہ سے نکلنے والے پہلے جملے کو سن کر سالار سکندر کا دل قہقہے مار کر ہنسنے کو چاہا تھا۔ اسے سکندر عثمان یاد آئے تھے۔ اس کے بچپن میں اسکول میں اس کے ٹیچرز سے ملتے ہوئے وہ اپنی اس پانچویں "خبیث اولاد" کی عزت انہیں الفاظ میں کرتے تھے کیوں کہ سائیکاٹرسٹ نے انہیں سختی سے سمجھایا تھا کہ ان کے ملامتی جملے ان کے اس غیر معمولی ذہین بیٹے کے دماغ اور نفسیات پر برے اثرات چھوڑ سکتے ہیں اور اپنی اس پانچویں اولاد کے کارناموں پر جلنے کڑھنے کے باوجود سکندر عثمان اسے آئی لو یو بھی کہتے تھے اور آئی ایم پراؤڈ آف یو (مجھے تم پر فخر ہے) بھی۔۔۔
ورلڈ بینک کا صدر سالار سکندر کا باپ نہیں تھا مگر امریکا تھا اور اس وقت اگر بینک کے صدر کو اپنے عہدے کے لالے پڑے ہوئے تھے تو امریکا کو افریقہ میں اپنے مفادات اور اس ساکھ کے جس اچھی ساکھ کا اسے وہم تھا۔ سالار سکندر انہیں اس وقت وہ مسیحا لگ رہا تھا جو "سب کچھ" کر سکتا تھا کم از کم افریقہ میں۔۔۔ قدرت نے بیٹھے بٹھائے اس کے ہاتھ میں Hidas' touch دے دیا تھا کہ وہ وہاں جس چیز کو چھوتا وہ سونا ہو جاتی اور انہیں اس وقت سالار سکندر کی زندگی چاہیے تھی۔ اس کی زندگی اس کی موت نہیں۔۔۔ اس کا ساتھ۔۔۔ اس کی مخالفت نہیں۔
پریذیڈنٹ کے جملے پر بورڈ روم کے لوگوں نے تالیاں بجائی تھیں یوں جیسے وہ پریذیڈنٹ کی تعریف کی تائید کر رہے ہوں۔ سالار نے شکریہ ادا کیا تھا اور پریذیڈنٹ کے سیٹ سنبھالنے کے بعد سب لوگوں کی طرح اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔
پریذیڈنٹ نے کانگو کی صورت حال سے گفتگو کا آغاز کیا تھا اور وہاں ورلڈ بینک کے ملازمین پر ہونے والے حملوں میں زخمی اور مارے جانے والے لوگوں کے لیے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی تھی اور اس کے بعد پیٹرس ایباکا کو شان دار خراج عقیدت پیش کیا تھا چند جملوں میں اور پھر وہ سالار سکندر کی رپورٹ پر آگیا تھا جو بینک کے بورڈ آف گورنرز نے "پڑھ" لی تھی۔ نہ صرف "پڑھ" لی تھی بلکہ اس رپورٹ کی تمام سفارشات کو مانتے ہوئے ایک انکوائری کمیشن تشکیل دیا گیا تھا جو اس پروجیکٹ کو وقتی طور پر معطل کرتے ہوئے نئے سرے سے اس کا جائزہ لے گا۔
سالار سکندر نہ حیران ہوا تھا نہ متاثر۔۔۔ اسے اندازہ تھا ورلڈ بینک اس سے کم میں کانگو میں دوبارہ داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ انہیں وہ پروجیکٹ اب ان حالات میں ختم کرنا ہی تھا اور اگر وہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ بورڈ آف گورنرز نے وہ رپورٹ "اب" پڑھی تھی اور اس کو فوری طور پر متفقہ طور پر منظور کر لیا تھا تو ان کے پاس اس کے علاوہ اور چارہ ہی نہیں تھا۔ یہ نقصان کو کنٹرول کرنے کے لیے اختیار کی جانے والی سی آئی اے کی حکمت عملی کا پہلا حصہ تھا۔ یہ پنڈورا باکس ان کی وجہ سے کھلا تھا اب اس کو انہیں ہی بند کرنا تھا۔ وہ جس جارحیت کو بہترین حکمت عملی مان کر چلے تھے ناکام ہو گئی تھی تو انہیں اب بیک فٹ پر جا کر دفاعی حکمت عملی اختیار کرنی پڑ رہی تھی۔
سالار سکندر خاموشی سے پریذیڈنٹ کی گفتگو سنتا رہا تھا۔ اس نے اپنی گفتگو کے اختتام پر سالار سکندر کو دی جانے والی نئی ذمہ داریوں کا اعلان کیا تھا۔ بورڈ روم میں بجتی ہوئی تالیوں میں وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ اپنی بے وقعت خدمات کے صلے میں ملنے والے اہم ترین عہدہ کی قدر و قیمت اندازہ لگا رہا تھا۔
اس کی پریزنٹیشن جو اس نے کچھ دن پہلے اسی بورڈ روم میں پیش کرنے سے بھی کئی ماہ پہلے ورلڈ بنک کو بھیجی

تھی اور جس پر اسے خاموشی سے رپورٹ واپس لینے یا عہدہ چھوڑ دینے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اب بورڈ روم میں دوبارہ چلائی جا رہی تھی اور بورڈ روم میں بیٹھا ہوا ہر شخص اس رپورٹ میں پیش کیے جانے والے حقائق اور سلائیڈز کو دیکھ کر یوں حیران و مضطرب نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے وہ زندگی میں پہلی بار اس رپورٹ سے اور اس رپورٹ کے اندر پیش کیے جانے والے حقائق سے متعارف ہو رہا ہو۔ اگر وہ ایکٹرز تھے تو کسی تھرڈ کلاس تھیٹر کمپنی کے اور اگر منافق تھے تو اعلا معیار کے...

سالار کو وہاں بیٹھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دنیا کے طاقت ور ترین مالیاتی ادارے کے ہیڈ کوارٹر میں نہیں کسی گھٹیا تھیٹر میں چلنے والے مزاحیہ ڈرامے کے سامنے بیٹھا ہے۔ جس میں ہر ایکٹر اوور ایکٹنگ کر رہا تھا اور مشین میں ریکارڈ قہقہے اور تالیاں ہر ہر جملے اور ایکسپریشن پر بج بج کر اسے ماسٹر پیس ثابت کرنے پر تلے تھے۔

"میں صدر اور بورڈ میں موجود تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے یہاں آنے کا موقع دیا۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ اس رپورٹ کو بنیاد بناتے ہوئے اس میں پیش کی جانے والی تمام سفارشات کو مان لیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے اس قدم کے اٹھانے سے ورلڈ بینک کو ایک بار پھر کانگو میں اپنی ساکھ بحال کرنے میں مدد ملے گی۔"

میٹنگ پر سالار سکندر کو بات کرنے کے لیے کہا گیا تھا اور اس نے بہت مختصر بات کی تھی۔ ٹو دا پوائنٹ' فارمل... پروفیشنل... جذباتیت کے بغیر... اور اسی دو ٹوک انداز میں جس کے لیے وہ مشہور تھا۔

"میں شکر گزار ہوں کہ ورلڈ بینک اور بورڈ آف گورنرز نے مجھے نائب صدر کے لیے منتخب کیا لیکن میں اپنی ذاتی مصروفیات کی وجہ سے یہ عہدہ نہیں سنبھال پاؤں گا۔ مجھے یقین ہے ورلڈ بینک کی ٹیم میں اس عہدے کے لیے مجھ سے زیادہ موزوں لوگ موجود ہیں۔"

صدر نے اس کے آخری جملوں پر بے چینی سے اپنی نشست پر پہلو بدلا۔ اسے توقع تھی اور صرف "ہاں" نہیں "نہیں" توقع تھی کہ سالار سکندر کا جواب اس آفر پر کیا آئے گا لیکن اس کے باوجود اسے بے چینی ہوئی تھی۔ اس وقت انہیں اپنی ساکھ بچانا تھی اور یہ کام اس وقت سالار ہی کر سکتا تھا۔

وہ میٹنگ اس کے بعد دو تین منٹ کے اندر ختم ہو گئی اور اس کے بعد سالار ورلڈ بینک کے صدر سے اکیلے میں ملا تھا۔ وہاں کا ماحول الگ تھا' جو باتیں ہوئی تھیں وہ بھی کچھ اور تھیں۔

"مجھے اپنے کمرے سے چوری ہونے والی تمام چیزیں چاہئیں۔ لیپ ٹاپ... ٹریول ڈاکومنٹس... میرے باقی ڈاکومنٹس۔"

سالار سکندر نے اس کمرے میں میٹنگ کے شروع میں ہی ایجنڈا سیٹ کیا تھا' اب اس کا کچھ بھی داؤ پر نہیں لگا تھا اور وہ باتیں منوانے ہی آیا تھا۔

"آپ کے کمرے سے چوری ہو جانے والی چیزوں سے ورلڈ بینک کا کیا تعلق..."

صدر نے انجان بننے کی پہلی اور آخری کوشش کی تھی۔ سالار نے بات کاٹ دی تھی۔

"اگر میری چیزیں نہیں مل سکتیں تو پھر مجھے کسی بھی ایشو پر بات کرنے کے لیے یہاں نہیں بیٹھنا..."

صدر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا پھر اس نے لہجہ نرم رکھتے ہوئے اسے جیسے چمکارا۔

"میں ہدایات جاری کرتا ہوں کہ فوری طور پر آپ کے نقصان کی تلافی کی جائے اور آپ کے ڈاکومنٹس کا متبادل..."

سالار نے اسی اکھڑپن سے اس کی بات کاٹی تھی۔ "مجھے اپنی چیزیں چاہئیں... نہ نقصان کی تلافی چاہیے نہ کوئی متبادل... مجھے اپنے اوریجنل ڈاکومنٹس چاہئیں۔"

خاموشی کے ایک لمبے وقفے کے بعد صدر نے ہتھیار ڈالے اور کہا۔

"ٹھیک ہے مل جائیں گے... لیکن ورلڈ بینک اور امریکا کو کانگو میں آپ کی ضرورت ہے۔" ایک شرط اس نے منوائی تھی ایک شرط انہوں نے رکھ دی تھی۔

"میں کسی کی کٹھ پتلی بن کر کانگو میں وہاں کے انسانوں کا استعمال نہیں کر سکتا نہ کروں گا۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"آپ کانگو میں جا کر وہ کریں جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔" صدر نے کہا۔

"میں بندھے ہاتھوں کے ساتھ کہیں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"نائب صدر کے طور پر آپ کو لامحدود پاورز دیے جائیں گے اور فوری طور پر مطلع بھی کر دیا جائے گا آپ اس پروجیکٹ کو روکنا چاہتے ہیں یا وہاں چلنے والے کسی بھی پروجیکٹ کو... آپ کو ہیڈ کوارٹر کی منظوری کی ضرورت نہیں... آپ کو اختیار دیا جائے گا کہ آپ یہ فیصلہ خود کر سکیں گے۔"

چند لمحوں تک سالار بول نہیں سکا۔ یہ جال تھا تو پکا تھا پھانسہ تھا تو اچھا... وہ ماتھے پر بلوں کے ساتھ ہونٹ کاٹتا میز کے دوسری طرف بیٹھے اس شخص کو دیکھتا رہا جس کی کرسی کسی بھی وقت جانے والی تھی اور یہ اندازہ صرف صدر ہی کو نہیں سب کو تھا مگر وہ ایک باعزت راستہ چاہتا تھا۔ لاتیں کھا کر جانے کے بجائے باتوں کے ذریعے جانا چاہتا تھا۔

"جتنے اختیارات آپ مجھے دے کر کانگو میں بھیجنا چاہتے ہیں' اتنے اختیارات آپ کسی کو بھی دے کر کانگو بھیج دیں وہ صورت حال سنبھال لے گا۔" سالار نے کچھ لمحے خاموشی کے بعد کہا۔

"ایشو اختیارات کا نہیں ہے نیت کا ہے... جو تم افریقہ میں کرنا چاہتے ہو' کوئی دوسرا نہیں کرنا چاہے گا۔" سالار اس شخص کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"کچھ وقت لو... سوچو... پھر فیصلہ کرو۔" اسے قید کر کے آزاد کیا گیا تھا۔

اس نے واپسی پر بھی میڈیا سے بات نہیں کی۔ الجھن تھی کہ اور بڑھی تھی... گھٹن تھی کہ سوا ہوئی تھی۔ واپسی کا راستہ بھی اس لیموزین کے کانٹوں پر طے ہوا تھا۔

ہوٹل میں واپس آتے ہی اس نے کمرے میں ٹی وی پر نہ صرف ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹر جاتے' اپنی فوٹیج دیکھ لی تھی بلکہ نیوز چینلز پر اپنی تعیناتی کی بریکنگ نیوز بھی دیکھ لی تھی۔ "وہ" اس کے لیے "انکار" مشکل سے مشکل تر بنا رہے تھے... جال کی ڈوریاں کستے جا رہے تھے۔ اس کا سیل فون منٹوں میں مبارک باد کے پیغامات اور کالز سے بجنے لگا تھا۔

پہلے اس فون کا نہ بجنا قیامت تھا اور اب بجے چلے جانا عذاب اور اس سب کے بیچوں بیچ اس نے امامہ کو کال کی تھی یہ جاننے کے باوجود کہ یہ خبر اس تک بھی پہنچ گئی ہوگی۔ اس کا ردعمل کیا ہو سکتا تھا؟ اسے یاد تھا اس نے امامہ کے ساتھ پہلے عمرے کے بعد اس سے وعدہ کیا تھا وہ بینک کی ملازمت چھوڑ دے گا' نوکری اس کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔ وہ نوکری کبھی بھی' کہیں بھی حاصل کر سکتا تھا مگر اس سے پہلے اس نے کبھی یہ غور نہیں کیا تھا کہ وہ جن جگہوں پر کام کرتا رہا تھا۔ وہ بلاواسطہ یا بالواسطہ "سود" سے منسلک رہے تھے۔ بڑے بڑے مالیاتی ادارے... آرگنائزیشن وہ سب جو دنیا کی اکنامک پلس چلاتے تھے۔ وہ سود کے خون سے ہی چلاتے تھے۔ فلاحی کام ہو یا سماجی ذمہ داری... پر خیرات کا رستہ بھی وہیں سے نکلتا تھا اور سالار سکندر اس سب کا حصہ تھا۔ اس بین الاقوامی مالیاتی نظام کا ایک پرزہ تھا جو سود کے پیسے سے چل رہا تھا... وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا اسے "احکامات" کا علم نہیں تھا۔ وہ یہ اعتراف کرتا تھا اسے تمام "حدود" کا پتا تھا اور وہ "حدود" توڑنے کا گناہ گار چلا آرہا تھا... زندگی میں بہت دفعہ رزق ہمیں مجبور کر دیتا ہے کہ ہم کھانے والے پیٹ کا سوچیں کمانے والے ہاتھ کا نہیں... سالار کو رزق کی مجبوری

نہیں تھی مگر کامیابی کی بھوک ضرور تھی۔۔۔ احساس کیے بغیر۔۔۔
امامہ نے پہلی دفعہ بڑی ڈھٹائی سے اس شیشے کے گھر کو توڑا تھا جو اس نے اپنے گرد بنایا تھا۔ اسے وہ عکس دیکھنے پر مجبور کیا تھا جسے وہ اپنا نہیں مانتا تھا۔۔۔ وہ اعتراف نہیں کرتا تھا لیکن شرمسار ہو گیا تھا۔۔۔ پریشان بھی۔۔۔ لیکن پھر اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ اس کا بینک کے ساتھ کانٹریکٹ ختم ہو رہا تھا اور وہ اسے دوبارہ ری نیو نہیں کرے گا۔
امریکا جا کر اس نے پی ایچ ڈی کے ساتھ جس مالیاتی ادارے میں جز وقتی اکانومسٹ کی نوکری کی تھی۔ وہ کوئی انویسٹمنٹ بینک نہیں تھا، لیکن کہیں نہ کہیں وہ بھی سود کے کاروبار سے مبرّا نہیں تھا، لیکن سالار اپنے آپ کو یہ تسلی دلاتا تھا کہ وہ وہاں ایک اکانومسٹ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ وہ ادارہ اس سے سود سے منسلک کوئی کام نہیں لے رہا مگر ضمیر کہیں نہ کہیں ایک سوئی اسے چبھوتا رہتا تھا۔۔۔ اس کی تنخواہ وہیں سے آتی تھی، جہاں سود کا منافع آتا تھا۔
ورلڈ بینک کو جوائن کرنے کے فیصلے سے امامہ خوش نہیں تھی، اس کا اعتراض وہی تھا اور وہیں تھا۔
"تم بے شک ورلڈ بینک کے پروجیکٹس سے منسلک ہو رہے ہو لیکن ورلڈ بینک کرتا تو سود کا کاروبار ہی ہے نا۔۔۔ چھوٹے بینک افراد کا استعمال کرتے ہیں ورلڈ بینک قوموں کا۔۔۔ تم مجھے بتاؤ فرق کیا ہوا۔۔۔؟ آسان قرضہ۔۔۔ سستا قرضہ۔۔۔ لونگ ٹرم قرضہ۔۔۔ شارٹ ٹرم قرضہ۔۔۔ آسان شرائط کا قرضہ۔۔۔ کوئی ایسا قرضہ ہے ورلڈ بینک کے پاس جس پر وہ سود نہ لیتا ہو۔۔۔" اس نے سالار کے ساتھ بحث کی تھی۔
جبریل ابھی ایک سال کا تھا۔۔۔ سالار کو لگا تھا زندگی یک دم پرسکون ہونے لگی ہے۔۔۔ ایک خوش حال خاندان۔۔۔ زندگی کا وہ فیز جو وسیم اور سعد کی حادثاتی موت کے بعد امامہ کے ڈپریشن اور پاکستان چلے جانے کے ساتھ شروع ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن ختم ہوتا چلا گیا تھا اور تب جو موقع سالار کو ورلڈ بینک کی صورت میں ملا تھا وہ اس کے تجربے اور عمر کے حساب سے، بہت شاندار تھا۔ وہ امامہ کے اعتراضات پر بے حد ناراض ہوا تھا۔
"اگر ہم اسی طرح ایک ایک چیز میں مین میخ نکالتے رہیں گے تو پھر اس معاشرے اور سسٹم میں تو کہیں بھی کام نہیں کر سکیں گے کیوں کہ یہ تو پورا معاشرہ سود پر کھڑا ہے اور وہ ہمارے لیے اپنے سسٹم کو نہیں بدلیں گے۔" اس نے امامہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
"پھر تو ہمیں حلال کھانے کی کوشش بھی ترک کر دینی چاہیے۔ پھر تم سپر اسٹور میں ڈبوں پر ان کے اجزا کیوں چیک کرتے رہتے ہو۔۔۔؟ بس یہ سمجھ کر کھا لینا چاہیے یہ سب کچھ کہ یہ ہمارا نہیں ان کا معاشرہ ہے اور وہ اپنے سپر اسٹور میں وہ چیزیں رکھیں گے جو انہیں پسند ہیں۔"
امامہ نے چند لمحوں کے لیے اسے لاجواب کر دیا تھا۔ وہ بحث جاری رکھنے کے بجائے وہاں سے اٹھ گیا تھا لیکن امامہ کے ناخوش ہونے کے باوجود اس نے ورلڈ بینک جوائن کر لیا تھا اور ورلڈ بینک جوائن کرنے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اس نے اپنا ایگری منٹ اور جاب پروفائل کے کاغذات امامہ کو زبردستی پڑھ پڑھ کر سنائے تھے۔ اس نے سب کچھ سننے کے بعد ان پیپرز کو واپس لفافے میں ڈال کر اسے دیتے ہوئے کہا تھا۔
"تم سود کے پیسے سے انسانیت کی خدمت اور بہتری کے خواب دیکھ رہے ہو اور تمہیں لگتا ہے کہ اس میں فلاح ہے۔۔۔! نہیں ہے۔۔۔ سود کا ثمر انسانوں کی زندگی بدل سکتا ہے، مگر تباہی میں۔۔۔ بہتری میں نہیں۔"
اس کی سوئی جہاں اٹکی تھی وہیں اٹکی رہی تھی۔۔۔ امامہ ضدی تھی، سالار کو اس کا اندازہ تھا۔۔۔ وہ خود بھی ضدی تھا لیکن ان کی ضد کبھی ایک دوسرے کے مقابل نہیں آئی تھی۔۔۔ کہیں نہ کہیں ان میں سے کوئی نہ کوئی دوسرے کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا تھا۔۔۔ وہ پوائنٹ آف نو ریٹرن پر کبھی نہیں گئے تھے۔۔۔ اس ایک ایشو پر بھی اس سے شدید نظریاتی اختلاف رکھنے کے باوجود امامہ نے ہر بار روزگار کے سلسلے میں اس کے انتخاب کو بہ امر مجبوری قبول تو

کیا تھا لیکن اس نے کبھی اس روزگار کے بارے میں زبان بندی نہیں کی تھی اور اس کی یہ برملا تنقید سالار کو خفا بھی کرتی تھی اور کمزور بھی۔۔۔۔
اس دن بھی امامہ کو فون کرتے ہوئے اسے احساس تھا کہ وہ اس سے کیا سننے جارہا ہے لیکن خلاف توقع امامہ نے اس کے نئے عہدے کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ اس سے جبریل اور عنایہ کی باتیں کرتی رہی۔ حمین کے بارے میں بتاتی رہی۔۔۔۔ یہاں تک کہ سالار کا احساس جرم حد سے گزر گیا۔ وہ جیسے چاہتا تھا کہ وہ اسے ملامت کرے۔ کوئی تو مبارک باد دینے کے بجائے اس کے ضمیر کو کچوکے لگائے۔
"تمہیں پتا ہے ورلڈ بینک نے مجھے وائس پریذیڈنٹ۔۔۔۔"
امامہ نے اس کو بات مکمل نہیں کرنے دی۔ "ہاں۔" اس نے یک حرفی جواب دیا۔
"تو؟" سالار کو اس یک حرفی جواب سے تسلی نہیں ہوئی۔
"تو کیا؟" امامہ نے مدہم آواز میں پوچھا۔
"تو تم کچھ نہیں کہو گی؟" اس نے جان بوجھ کر یہ نہیں کہا تھا کہ تمہارا کیا خیال ہے۔
"نہیں" ایک اور یک حرفی جواب آیا۔
"کیوں؟" وہ بے قرار ہوا۔
"تم ہر فیصلہ اپنی مرضی سے کرتے ہو۔۔۔ پھر رائے دینے کا فائدہ۔"
سالار ایک لمحہ کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے مدہم آواز میں کہا۔
"میں نے ابھی آفر قبول نہیں کی۔"
"کرلو گے۔۔۔ میں جانتی ہوں۔" جواب نے اس کے چودہ طبق روشن کیے اور ساتھ اسے ہنسایا بھی۔
"اس میں ہنسنے والی تو کوئی بات نہیں تھی۔" امامہ کو اس کی یہ ہنسی اچھی لگی تھی پھر بھی اس نے کہا۔
"میں جب بھی تمہاری بات نہیں مانتا' نقصان اٹھاتا ہوں۔"
سالار نے اس لمحے عجیب اعتراف کیا۔ وہ جیسے اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس نے ورلڈ بینک جوائن کرنے کے حوالے سے اس کی بات نہ مان کر غلط فیصلہ کیا تھا لیکن وہ فی الحال اسے اتنے کھلے لفظوں میں یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس بار وہ ہنس پڑی تھی۔
"بڑی خوشی ہوئی یہ بات سن کر۔۔۔ لیکن میں یہ تو نہ سمجھوں نا کہ تم آئندہ ہمیشہ میری بات مانا کرو گے؟" اس نے سالار پر چوٹ کی تھی۔
"بالکل" جواب تڑاخ سے آیا۔
اس بار دونوں ہنس پڑے' پھر سالار نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس سے کہا۔
"یہی وہ بات تھی جو کانگو سے آتے ہوئے تم سے کہنا چاہتا تھا۔"
امامہ کو یاد آیا اسے ایک اعتراف کرنا تھا' واپس آکر۔۔۔۔
"اوہ۔۔۔ میں نے سوچا' پتا نہیں کیا کہنا چاہتے تھے تم۔" وہ دھیرے سے ہنسی' پھر اس نے کہا۔
"ایسا کیا ہوا ہے کہ تم یہ بات کہہ رہے ہو مجھ سے۔۔۔ یا تب کہنا چاہ رہے تھے۔"
وہ یقیناً "بے وقوف" نہیں تھی۔ سالار کی سمجھ میں نہیں آیا اس بات کا کیا جواب دے۔۔۔ جواب دے بھی یا نہیں۔۔۔ جو پچھتاوا پیٹرس ایباکا سے ملاقات اور اس پروجیکٹ کے بارے میں ان حقائق کو جان کر شروع ہوا تھا وہ امریکہ میں پہنچ کر احساس جرم میں تبدیل ہوجائے گا۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔
"تم مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہتے؟" امامہ نے اس کی خاموشی کو پہیلی کی طرح پوچھا۔

"ابھی نہیں۔۔۔" اس نے جواب دیا۔
"یہاں کب آؤ گے؟" امامہ نے بات بدل دی تھی۔
"ابھی فلائٹس بند ہیں کنشاسا کے لیے۔۔۔ ایئرپورٹ عارضی طور پر بھی فنکشنل نہیں ہے۔ میں کوشش کررہا ہوں کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جاؤں لیکن تم پریشان تو نہیں ہونا؟" سالار نے اس سے پوچھا۔
"اب نہیں ہوں اور تم بھی پریشان مت ہونا۔۔۔ ہم سب محفوظ ہیں اور مجھے اور حمین کو علاج کی تمام سہولیات مل رہی ہیں۔"
امامہ نے اس کے لہجے میں نمودار ہوتی ہوئی تشویش کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ وہ خود سرجری اور حمین کے پری میچور ہونے کی وجہ سے سفر نہیں کرسکتی تھی کم از کم ایک ماہ تک۔۔۔ ورنہ سالار خود وہاں جانے کے بجائے اسے وہاں سے نکلوانے کی کوشش کرتا۔
سالار نے بہت مطمئن ہو کر کچھ دیر جبریل اور عنایہ سے بات چیت کی اور اس کے بعد کال ختم کرکے وہ اس لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوا اور ان کاغذات کی طرف جو ابھی کچھ دیر پہلے ایک سربہ مہر تھیلے میں ایک شخص اس کے کمرے میں اسے دے گیا تھا۔ سب کچھ بالکل محفوظ حالت میں تھا کوئی چیز ڈیلیٹ یا غائب یا بدلی نہیں گئی تھی۔ اس کے باوجود سالار کو اپنے ان باکس میں جاتے ہی یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ کوئی اس سے پہلے بھی وہاں تھا یا شاید اس وقت بھی وہ مانیٹر ہو رہا ہوگا کیونکہ اس کے ان باکس میں موجود سات گھنٹے پہلے تک آنے والی ہر ای میل کھولے اور پڑھے جانے کی نشاندہی کررہی تھی۔
وہ اپنے فون سے اپنے ان باکس کو access نہیں کرپا رہا تھا ورنہ شاید یہ بات اسے پہلے ہی پتا چل جاتی۔ شاید ورلڈ بینک کے صدر کے ساتھ ملاقات میں اس نے ان چیزوں کی واپسی کا مطالبہ نہ کیا ہوتا تو اس کا ہیکڈ ای میل ایڈریس کبھی دوبارہ اس کے لیے accesible نہ ہوتا۔
اسے اب غصہ نہیں آرہا تھا نہ ہی بے بسی کی کسی کیفیت کو اس نے اس وقت محسوس کیا تھا۔ جو بلائیں اسے چمٹ چکی تھیں وہ اس کا اپنا انتخاب تھیں۔ ان باکس میں موجود ای میلز پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے ایک ای میل پر ایک لمحہ کے لیے جیسے اس کا دل لمحہ بھر کے لیے رکا تھا۔ وہ پیٹرس ایباکا کی طرف سے میڈیا سینٹر کے باہر سے اسے بھیجا جانے والا آخری پیغام تھا جو بہت لمبا ہو جانے کی وجہ سے ایباکا نے ٹیکسٹ کرتے کرتے اسے ای میل کردیا تھا۔ بوجھل دل کے ساتھ اس نے اس ای میل کو کھول لیا۔
"تمہیں پتا ہے میں اس وقت کہاں کھڑا ہوں؟ ٹائم وارنر سینٹر۔۔۔ اور کس لیے۔۔۔؟ میں ابھی کچھ دیر پہلے اینڈرسن کوپر کے ساتھ تھا سی این این اسٹوڈیو میں۔۔۔ اس کے شو میں شرکت سے پہلے ابتدائی بات چیت کے ایک سیشن کے لیے۔۔۔ مجھے پتا ہے اس وقت تم کہو گے "او مائی گاڈ!"
" Man You did it " (یہ تم نے کیا ہے!)
"Yes i did it" ۔ (جی جناب)
سالار نے ایک لمحہ کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ وہ کئی راتوں سے سو نہیں پایا تھا۔ آنکھوں میں جلن تھی لیکن جس چیز نے اس وقت اس کی آنکھوں کو دھندلایا تھا وہ۔۔۔ وہ مسکراہٹیں تھیں۔ ایباکا کے جملے کے اختتام پر جس میں وہ فخریہ انداز میں مسکرایا اور سیٹ اچھال کر آنکھیں گھما رہا تھا۔
"اینڈرسن کوپر سے ملنے کے بعد میں نے سب سے پہلا میسج تمہیں کیا ہے۔۔۔ کیونکہ میں یہاں تک کبھی نہ پہنچ پاتا اگر مجھے تمہاری صورت میں ورلڈ بینک کی بے ضمیر دنیا میں ضمیر کی جھلک نہ دکھائی دیتی۔۔۔ میں نے بھی تمہیں یہ نہیں بتایا کہ جب میں پہلی بار تم سے ملا تھا تو میں اس جنگ میں ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔۔۔

ناامیدی اور مایوسی کے علاوہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں تھا۔۔۔ میں ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔۔۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہو رہا تھا اور میں بہت کمزور تھا۔
میں ان دیوؤں کے سامنے واقعی ایک پگمیز (بونا) تھا جو میرے ملک کو لوٹنے آئے تھے اور میں کچھ کر نہیں پا رہا تھا اپنے لوگوں کے لیے۔۔۔ اور پھر میں تم سے ملا اور مجھے لگا مجھے ابھی ہتھیار نہیں ڈالنے چاہئیں۔۔۔ ابھی امید تھی۔۔۔ تمہاری صورت میں۔۔۔ اور میں ٹھیک تھا۔۔۔ میں نے امید نہیں چھوڑی جنگ جاری رکھی اور میری امید مجھے یہاں تک لے آئی کہ اب چند دنوں میں پوری دنیا کانگو کے بارے میں بات کرے گی۔۔۔ ہم چھوٹے "کالے" "بد صورت"۔۔۔ معمولی انسانوں کے بارے میں۔۔۔ جو دنیا میں صرف مفتوح اور غلام بننے نہیں آئے۔۔۔ میں نے آج کوور کو تمہارے بارے میں بھی بتایا۔ وہ تم سے بھی بات کریں گے۔۔۔ مجھے یقین ہے اب کانگو کی تاریخ بدلنے والی ہے۔۔۔ میرے لوگ اب ایک اچھی زندگی جئیں گے۔۔۔ "انسانوں" جیسی زندگی "جانوروں" جیسی نہیں۔۔۔ تم جب واشنگٹن پہنچ جاؤ تو مجھے انفارم کرنا۔۔۔ ہم دونوں کو ملنا ہے۔۔۔ کافی دن ہو گئے۔ اسٹار بکس کی کافی اب۔۔۔ اس بار بل میں پے کروں گا۔۔۔" ای میل کا اختتام ایک اور مسکراہٹ سے ہوا تھا۔ ایک آنکھ مارتی شرارتی مسکراہٹ سے۔
سالار سکندر کسی بت کی طرح ان جملوں کو بار بار پڑھتا رہا۔۔۔ بار بار۔۔۔ ہر بار آخری جملے تک پہنچتے پہنچتے اسے لگتا تھا وہ گزشتہ سارے جملے بھول چکا ہے۔۔۔ اس نے درجنوں بار اس رات اس ای میل کو پڑھا تھا۔ پیٹرس ایباکا باتونی تھا۔۔۔ بلا کا باتونی۔۔۔ بات شروع کرتا تو بس شروع ہی ہو جاتا تھا۔۔۔ پتا نہیں کن کن کتابوں اور مصنفین اور فلاسفرز کے حوالے دیتا تھا۔۔۔ سالار سکندر اس کی گفتگو سے محظوظ ہوتا تھا اور کبھی کبھار تنگ بھی۔۔۔
آج اس ای میل میں ایباکا نے کسی کتاب، کسی مصنف، کسی فلاسفر کا قول نہیں دہرایا تھا۔۔۔ اس نے صرف وہ کہا تھا جو اس کی اپنی سوچ، اپنے احساسات تھے۔۔۔ ہمیشہ کی طرح جذباتیت سے لتھڑے ہوئے۔۔۔ اس نے اس امید کی بات کی تھی جو وہ کھو رہا تھا اور جو ایباکا کو وہاں تک لے آئی تھی۔۔۔ کبھی کبھار زبان سے الفاظ نہیں الہامی باتیں نکلتی ہیں۔ اس ای میل میں ایباکا نے بھی ایسی ہی ایک بات کہی تھی جو حرف بہ حرف ٹھیک تھی۔۔۔ کانگو کی تاریخ بدل رہی تھی اور اس تاریخ کو ایباکا نے اپنے خون سے بدلا تھا۔
سالار نے اس ای میل کو بند کر دیا تھا۔ اس میں ایباکا نے کوئی اہم بات شیئر کی ہوتی تو اس کے ان باکس سے وہ ای میل غائب ہو چکی ہوتی۔ لیکن اس ای میل نے اس کے دل کے بوجھ کو اور بڑھا دیا تھا۔ وہ جس ترازو کے دو پلڑوں میں جھول رہا تھا اس کا عدم توازن اور بڑھ گیا تھا۔
وہ اس ساری رات مصلے پر بیٹھا گڑگڑاتا رہا تھا۔۔۔ اللہ تعالیٰ سے آزمائش میں آسانی کی بھیک۔۔۔ سیدھے راستے کی بھیک۔۔۔ جس پر سے وہ ایک بار پھر سے بھٹک گیا تھا اور ان لوگوں میں شامل نہ کرنے کی بھیک، جن پر اللہ کا عذاب آتا تھا۔۔۔ کہیں نہ کہیں اسے خوف بھی تھا کہ وہ اللہ کے عذاب کو دعوت دے رہا تھا اور اگر اولاد اور بیوی اور مال کی آزمائش جان لیوا تھی تو جان لیوا یہ احساس بھی تھا۔
فجر کے وقت اسے ڈاکٹر سبط علی کا خیال آیا تھا۔۔۔ اور خیال نہیں آیا تھا۔۔۔ وہ جیسے دیوانہ وار ان کی طرف لپکا تھا۔۔۔ وہ ایمرجنسی میں ٹکٹ حاصل کر کے اگلی رات ہی پاکستان دوڑا چلا آیا تھا۔
ڈاکٹر سبط علی اسے ہمیشہ کی طرح ملے تھے بگرم جوشی سے۔۔۔ لیکن حیرانی سے۔۔۔ وہ کئی سالوں کے بعد اس طرح اچانک ان کے پاس بھاگتا آیا تھا۔۔۔ انہوں نے اس سے باری باری سب کی خیریت دریافت کی۔
"امامہ ٹھیک ہے؟"
"جی۔۔۔!" وہ ہمیشہ کی طرح اس دن بھی ان کی اسٹڈی میں اکیلا ان کے پاس بیٹھا تھا۔۔۔ سر جھکائے۔

"جبریل کیسا ہے؟" انہوں نے اگلا سوال کیا۔
"وہ بھی ٹھیک ہے۔"
"عنایہ؟" "وہ بھی..."
"اور حمین؟"
"وہ بھی..." وہ سر جھکائے ایک ایک کے بارے میں بتاتا گیا۔ ڈاکٹر سبط علی الحمدللہ کہتے رہے، پھر ایک لمبی خاموشی کے بعد انہوں نے اس سے مدھم آواز میں پوچھا۔
"اور تم؟"
"نہیں، میں ٹھیک نہیں ہوں۔" اس بار سالار سکندر نے سر اٹھایا تھا اور پھر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ وہ دم بخود اسے دیکھتے رہے۔ وہ پہلی بار ایسے ٹوٹ کر رویا تھا۔
"مجھ سے ایک گناہ ہو گیا ہے ڈاکٹر صاحب!" اس نے روتے ہوئے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے رگڑتے ہوئے کہا۔
ڈاکٹر صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ وہ صرف اسے دیکھتے رہے تھے۔ چند لمحوں بعد انہوں نے کہا۔
"مجھے مت بتانا..." سالار نے حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھا۔
"آپ کو بتانے کے لیے ہی آیا ہوں یہاں۔"
"میں تمہارا گناہ جان کر کیا کروں گا؟ اب روک سکتا نہیں تمہیں... پچھتاوا دیکھ چکا ہوں... بہتر ہے اپنے اور اللہ کے درمیان ہی رکھو اسے... جو پردہ ہے اسے پڑا رہنے دو... اللہ غفور الرحیم ہے... معاف کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور معاف کرتا ہے اپنے بندوں کو۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح تحمل سے اسے سمجھایا تھا۔
"میں بتاؤں گا نہیں تو میری گمراہی ختم نہیں ہو گی... آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ میں کتنی تاریکی میں کھڑا ہوں... اندھیرا ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے اور مجھے اس تاریکی سے خوف آنے لگا ہے۔"
ڈاکٹر سبط علی نے اسے اس بے چارگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کے پاس وہ جب کبھی آتا تھا کسی مشکل میں ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے اسے ایسی حالت میں اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
"میں نے سود والا رزق چن کر اللہ کی حد توڑی ہے اور مجھ پر ایک کے بعد ایک پریشانی آ رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیا کروں۔"
وہ ایک بار پھر رونے لگا تھا۔ وہ اعتراف جو ضمیر کرتا رہتا تھا وہ آج پہلی بار کسی دوسرے انسان کے سامنے اپنی زبان سے کر رہا تھا۔
"توبہ کر لو اور وہ رزق چھوڑ دو۔" انہوں نے بلا توقف بڑی سہولت سے کہا۔
"توبہ آسان ہے مگر دلدل سے نکلنا آسان نہیں ہے میرے لیے۔" انہوں نے سالار کی بات کے جواب میں کہا۔
"آسان تو کچھ بھی نہیں ہوتا دنیا میں... لیکن ممکن بنا لیا جاتا ہے۔"
"میں 37 سال کا ہوں... اپنی عمر کے دس سال میں نے دنیا کے بہترین مالیاتی اداروں میں کام کیا ہے۔ سارا رزق سود سے کمایا ہے، وہ بھی جو میں نے اپنی ذات پر خرچ کیا وہ بھی، جو میں نے دوسروں پر خرچ کیا... جس رزق سے میں اپنی اولاد اور بیوی کی کفالت کر رہا ہوں۔ وہ بھی سود ہے... لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں اب کیا کروں؟"
ڈاکٹر سبط علی نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اتنے سالوں بعد آپ کو اب یہ احساس کیوں ہوا کہ آپ کا رزق حلال

نہیں حرام ہے؟
ان کا لہجہ اُسے پہلی بار عجیب محسوس ہوا تھا۔
"کیونکہ مجھے سکون نہیں ہے۔ زندگی میں کچھ نہ کچھ غلط ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے شاید میرا رزق میری آزمائشوں کی وجہ ہے۔"
وہ بے بس انداز میں کہہ رہا تھا۔
"آپ کو یاد ہے جب آپ میرے پاس امامہ کی بیماری کے دنوں میں آئے تھے اور کہتے تھے کہ آپ کے گھر میں بے سکونی کیوں ہے۔ امامہ آپ سے محبت کیوں نہیں کرتی۔ آپ نے اس کے لیے دنیا کی ہر نعمت کا انبار لگا دیا ہے۔ اس پر احسانوں کی حد کردی ہے۔ پھر بھی وہ آپ سے التفات کیوں نہیں رکھتی۔ بے رخی کیوں برتتی ہے؟ ناشکری کیوں ہے؟ احسان کو کیوں نہیں مانتی؟؟"
وہ ڈاکٹر سبط علی کا چہرہ دیکھنے لگا۔
"میں نے آپ سے کہا تھا۔ یہ سب اس کی وجہ سے نہیں ہو رہا' آپ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اس بے سکونی کی جڑ آپ کے رزق میں ہے۔ وہ رزق وہاں سے آتا رہے گا۔ آپ کی زندگی ایسی ہی رہے گی۔ تب آپ یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ میں اب تو بینک میں کام نہیں کرتا۔ اب تو کسی اور ادارے میں کسی اور حیثیت میں کام کرتا ہوں اور آپ نے یہ بھی کہا کہ میں ہمیشہ کی طرح امامہ کی حمایت کر رہا ہوں' اس کی کسی غلطی کو تسلیم نہیں کروں گا۔ ہر بات کا قصوروار آپ ہی کو قرار دوں گا۔"
وہ اسی طرح دھیمے انداز میں کہہ رہے تھے۔
"آپ نے تب بھی سوال کیا تھا اور جواب کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں نے آپ سے بحث نہیں کی تھی کیونکہ آپ بہت پریشانی میں تھے اس وقت۔۔۔ میں آپ کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن جو جواب میں نے تب آپ کو دیا تھا' آج بھی وہی دے رہا ہوں اور مجھے خوشی ہے آج آپ سوال کرنے میرے پاس نہیں آئے' حل ڈھونڈنے آئے ہیں۔"
وہ مسکرائے اور چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے' پھر انہوں نے دوبارہ بات شروع کی۔
"آپ جس کاروبار سے منسلک رہے وہ کروڑوں لوگوں کے گھروں اور زندگیوں میں بے سکونی اور تباہی لاتا ہے' پھر یہ کیسے ہوتا کہ وہ بے سکونی اور بے برکتی آپ کے دروازے پر دستک دینے نہ آتی۔ اللہ اپنی حدوں کو توڑنے والوں کو پسند نہیں کرتا' وہ مسلمان ہوں یا کافر۔"
سالار نے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں ٹوک دیا۔
"ڈاکٹر صاحب! مجھے اب امامہ سے کوئی شکایت نہیں ہے' وہ میری زندگی میں پریشانی اور بے سکونی کا باعث نہیں رہی۔۔۔ مجھے گھر کی طرف سے سکون ہے۔"
اس بار ڈاکٹر صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔
"کیونکہ امامہ کے لیے آپ کے التفات کا وہ عالم نہیں رہا جو اس وقت تھا جب امامہ آپ کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ تب اللہ نے آپ کو اس کی بے التفاتی اور بے رخی کے ذریعے بے سکونی دی کیونکہ اس سے زیادہ تکلیف آپ کو کوئی اور چیز نہیں پہنچا سکتی تھی۔ آج اللہ آپ کو اس چیز سے سب سے زیادہ تکلیف پہنچا رہا ہے' جو آج آپ کے لیے سب سے اہم ہے۔"
وہ گنگ رہ گیا تھا۔ بات درست تھی۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کی طرح اس کے عیبوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں اس کے دل میں چھپے چور کو عیاں کرتے جا رہے تھے۔

"آپ نے وقتی طور پر بینک کی نوکری چھوڑی، بلاواسطہ سود کے کاروبار سے منسلک ہونے کی بجائے کچھ عرصہ کے بعد بالواسطہ سود کے کاروبار سے منسلک ہوگئے۔ سالار سکندر مجھ سے زیادہ اچھی طرح آپ کو پتا ہے کہ حل کیا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اس حل کی طرف جانے پر آپ کا دل آمادہ نہیں ہے اور کبھی ہوگا بھی نہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ ٹھیک ہے لیکن میری سمجھ میں واقعی نہیں آرہا کہ میں کیا کروں۔"

اس نے ڈاکٹر صاحب کی ہر بات کو تسلیم کیا تھا۔ "میں نے پچھلے سال امریکہ میں ایک گھر mortgage کیا ہے۔ اس سال امامہ کی سالگرہ پر میں اس کو وہ گھر دینا چاہتا تھا۔ پانچ بیڈ روم کا گھر ہے۔ پرائیویٹ بیچ کے ساتھ... ساحل سمندر پر... بہت مہنگا... مجھے اگلے کئی سال اس کا mortgage ادا کرتے رہنا ہے۔ اب میرے تین بچے ہیں۔ ایک اسکول جارہا ہے' دو چند سالوں میں اسکول جانے لگیں گے۔ مجھے ان کو بہترین اسکولز میں پڑھانا ہے۔ بہترین تعلیم دلوانی ہے' بہترین یونیورسٹیز میں بھیجنا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے میرے باپ نے کیا اور اس سب کے لیے مجھے پیسہ چاہیے۔ مجھے ایک پر آسائش زندگی کی عادت رہی ہے۔ میں ان آسائشات کے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ ساری آسائشات اور لائف اسٹائل پیسہ مانگتا ہے اور میں اگر حلال اور حرام کی' سود کی بنیاد پر تفریق اور تمیز کرنے بیٹھوں گا تو پھر میں ان میں سے کچھ بھی نہیں کرسکوں گا... جہاں مجھے ترقی اور کامیابی نظر آتی ہے وہاں سود بھی ہے اور جہاں سود نہیں ہے وہاں ترقی کی وہ رفتار بھی نہیں ہے جس پر میں سفر کرتا رہا ہوں... اب آپ مجھے بتائیں' میں کیا کروں... میں کسی چھوٹی موٹی کمپنی میں کسی چھوٹے موٹے عہدے پر کام کرکے تھوڑا بہت پیسہ بنا کر جی سکتا ہوں لیکن اس سے میں خوش نہیں رہ سکتا۔ وہ آرگنائزیشنز جن میں مجھے اسپارک اور سکوپ دکھتا ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے' وہاں کسی نہ کسی شکل میں سود کی آمیزش ہے۔ حرام اور حلال کا فرق نہیں ہے... میں کیا کروں؟ یا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی یونیورسٹی میں فنانس اور اکنامکس پڑھا کر زندگی گزار لوں یا کسی کمپنی کا فنانشل آفیسر بن کر زندگی گزاروں۔"

وہ جیسے پھٹ پڑا تھا۔ وہ ساری کنفیوژن جو ذہن میں تھی' اب زبان پر آرہی تھی اور زبان پر آکر جیسے اس کے اعصاب کو سکون دینے لگی تھی۔

"آپ میرے رزق کو میرے ہر مسئلے کی وجہ قرار دے رہے ہیں۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں بھی اس رزق سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں... مجھے بھی سود سے نفرت ہے لیکن کوئی متبادل راستہ بھی نہیں ہے میرے پاس۔" وہ اب پھر سے رنجیدہ ہو رہا تھا۔

"میں متبادل راستہ بھی بنانا چاہتا ہوں لیکن اس میں بھی وقت لگے گا۔ تب تک میں کیا کروں... میں آج ورلڈ بینک کو چھوڑتا ہوں تو چند مہینوں میں قصۂ پارینہ ہو جاؤں گا... کانگو میں جو ہو رہا ہے۔ ہوتا رہے گا۔ یہ پروجیکٹ آج بند ہوا ہے۔ کل پھر چل پڑے گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے بڑے تحمل سے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس سے کہا۔

"سالار! آپ پہلے یہ فیصلہ کریں کہ وہ کیا چیز ہے، جو آپ کے لیے زیادہ پریشان کن ہے... آپ کی اپنی زندگی... یا دوسروں کی زندگی...

ہم دوسروں کی زندگی کو صرف اپنی زندگی پر ترجیح تو نہیں دے سکتے' دو ہی چوائسز ہوں تو ہم صرف اپنی ہی زندگی کو ترجیح دیں گے۔" ڈاکٹر سبط علی نے جیسے اسے آئینہ دکھایا تھا۔

"میرا ذہن اور زندگی اس وقت کسی دوراہے پر نہیں چوراہے پر آکر کھڑی ہوگئی ہے۔ دو راستے ہوں تو انسان پھر بھی فیصلہ کرلیتا ہے۔ سو راستوں کا کیا کرے؟" وہ عجیب بے بسی سے ہنسا تھا۔

"آپ مسیحا نہیں ہیں.... نہ ہی اللہ نے آپ کو مسیحا بننے کے لیے پیدا کیا ہے.... آپ کو اللہ نے ایک اچھا انسان اور مسلمان بننے کے لیے پیدا کیا ہے۔ پہلے وہ فرائض پورے کریں جو اللہ کی طرف سے اور ان لوگوں کی طرف سے آپ پر عائد ہوتے ہیں جو آپ کی ذمہ داری ہیں' پھر ان لوگوں کی ذمہ داری کندھوں پر اٹھانے کی کوشش کریں جن کے بارے میں آپ سے کبھی ڈائریکٹ سوال نہیں کیا جائے گا۔"

وہ اس کے دماغ کی گرہوں کو کھولنے لگے تھے۔

"زندگی میں ہم اچھے اور برے فیصلے کرتے ہیں اور ہم ان کی قیمت چکاتے ہیں' آپ اپنے بچوں کے سنہری مستقبل' آسائشوں اور ایک mortgaged گھر کی ملکیت حاصل کرنے کے لیے سود کھاتے رہنا چاہتے ہیں تو قیمت بھی آپ ہی چکائیں گے.... آپ کسی متبادل راستہ کی تلاش میں مہلت چاہتے ہیں تو بھی اختیار اور انتخاب آپ ہی کے ہاتھ میں رہے گا لیکن کبھی کبھار ہم بہتر راستے اور مناسب وقت کی تلاش میں اپنی زندگی کی مہلت استعمال کر بیٹھتے ہیں۔" وہ ان کی باتیں ویسے ہی دم بخود سن رہا تھا جیسے ہمیشہ سنتا آیا تھا۔

"پہلے آپ اپنے گھر کے اندر نااتفاقی اور بے سکونی سے آزمائے گئے.... اب آپ اپنے کیریئر میں مشکلات سے آزمائے جا رہے ہیں۔ میری دعا صرف یہ ہے کہ اگلی آزمائش اس سے بڑی نہ ہو۔"

جو گرہیں کھل رہی تھیں ڈاکٹر سبط علی نے انہیں جیسے کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ سالار اندر سے ہل رہا تھا۔

"آپ نے مجھ سے یہ سب تب کیوں نہیں کہا جب میں آپ کے پاس آنا شروع ہوا تھا اور میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں بینک میں کام کرتا ہوں۔ آپ کو پتا تھا کہ سود کے کاروبار سے منسلک ہوں' پھر تب آپ نے مجھ سے کیوں یہ ساری باتیں نہیں کہیں۔ اس طرح خبردار نہیں کیا.... کبھی بھی ٹوکا نہیں۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے شکایت کرنے لگا۔

"میں وہ مبلغ نہیں ہوں سالار! جو ہر شخص کو آتے ہی کٹہرے میں کھڑا کر دیتا ہے۔ یہ اللہ کی دنیا ہے اور اگر اللہ کی دنیا میں اللہ انسان کو اس کی بے عملی کے باوجود خود کھوجنے' خود سیکھنے کا موقع دیتا رہتا ہے تو میں کیسے آپ کو سرزنش کرنا شروع کر دیتا.... آپ جس رب کے ماننے والے ہیں اس کی کتاب کو زبانی یاد کرنے اور دہراتے چلے آنے کے باوجود اس میں دیے گئے احکامات سے روگردانی کر رہے ہیں.... آپ جس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ہیں اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور احکامات پر عمل کرنے کو تیار نہیں.... آپ جس عورت کے عشق میں گرفتار ہیں اس کے اصرار پر بھی اس رزق کو چھوڑ نہیں پا رہے.... تو ڈاکٹر سبط علی آپ کو کیسے بدل دیتا' کیسے روک دیتا۔"

وہ پانی پانی ہوا تھا اور ہوتا ہی گیا تھا۔

"میں آپ کو منع کرتا.... ڈراتا.... آپ میرے پاس آنا ہی چھوڑ دیتے.... میں نے سوچا' آتے رہیں گے' بدل جائیں گے....

مبارک باد

ملیحہ صدیقی کے آنگن میں پہلا پھول کھلا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے دلی مبارک باد اور دعائیں۔

اللہ تعالیٰ ملیحہ کے آنگن کی اس کلی کو لمبی عمر صحت اور خوشیاں عطا فرمائے۔ (آمین)

آپ کو یاد ہے جب میں نے ـــــ آپ سے پہلی ملاقات میں اپنی کچھ کتابیں آپ کو دی تھیں کہ ان کا مطالعہ کیجیے گا وہ اپنے علم کی دھاک بٹھانے کے لیے نہیں کیا تھا۔۔۔ آپ کو یہی جتانا چاہ رہا تھا۔۔۔ کہ آپ جس اقتصادی اور مالیاتی سسٹم کے ساتھ منسلک تھے وہ غیر اسلامی تھا۔۔۔ جائز اور حلال نہیں تھا۔۔۔ سود پر کھڑا کیا گیا تھا۔ اور میں نہیں مانتا ان کتابوں کے مطالعے کے دوران یہ خیال آپ کے ذہن میں نہ آیا ہو کہ آپ کا رزق سود سے آلودہ ہو رہا ہے۔۔۔ میں نہیں مانتا میرے پاس اتنی باقاعدگی سے لیکچرز کے لیے آتے رہنے کے باوجود آپ نے کبھی ان لیکچرز میں سود یا ربا کے حوالے سے کوئی ممانعت کوئی درس نہ سنا ہو اور آپ کو یہ خیال نہ آیا ہو کہ جس کی ممانعت اور مذمت کی جارہی ہے وہ وہی رزق ہے جو آپ بھی کما رہے تھے۔"

وہ ان کی باتوں کے جواب میں بولنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا وہ ٹھیک کہہ رہے تھے اس نے کئی بار ڈاکٹر سبط علی کو سود کے حوالے سے بات کرتے سنا تھا۔۔۔ وہ فوٹو گرافک میموری رکھتا تھا۔ آج بھی ہر وہ سوال دہرا سکتا تھا۔ ان کے جواب کے ساتھ جو کسی نے ڈاکٹر سبط علی سے اس حوالے سے پوچھا تھا۔ اسے یاد تھا جب اس نے پہلی بار ڈاکٹر سبط علی کو سود کے حوالے سے بات کرتے ہوئے سنا تھا تو وہ بہت خفیف ہوا تھا صرف وہی نہیں وہاں پر موجود وہ سارے افراد جو بینکس یا انویسٹمنٹ کمپنیز سے منسلک تھے۔

کسی نے ڈاکٹر صاحب سے یہ سوال کیا تھا کہ "آخر ربا یا سود میں ایسی خرابی کیا ہے کہ قرآن پاک اس کو حرام اور کاروبار کے منافع کو حلال کرتا ہے؟" ڈاکٹر صاحب نے تب یہ جواب دیا تھا۔

"سود اسلام کی بنیاد کے خلاف ہے ہمارا دین جن کچھ بنیادوں پر کھڑا ہے اس میں سے ایک انسانی ہمدردی اور مدد کا اصول ہے۔۔۔ اگر مسلمان ایک دوسرے کے بھائی اور مددگار ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ضرورت کے لیے اپنے مسلمان بھائی کو دی جانے والی رقم کو منافع کے ساتھ مشروط کردے۔۔۔ ہمارا دین اللہ تعالیٰ کی برتری کے علاوہ دنیا میں کسی اور سے ویسی عقیدت اور پرستش کے خلاف ہے۔۔۔ روپیہ صرف دنیاوی زندگی کو چلانے کا ذریعہ ہے اس روپے کو ہم اگر اپنا مقصد حیات بنا کر سرمایہ داری کے اصول اپنالیں گے تو ہم اس انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے سے ہٹا کر دولت کو اس مرتبے پر فائز کردیں گے۔۔۔

اگر قرآن میں اللہ فرماتا ہے کہ سود کا کاروبار کرنے والا اللہ اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کر رہا ہے۔۔۔ تو دولت کا بت بنا کر انسانوں کی ضرورتوں اور مجبوریوں کو استعمال کرتے ہوئے ان کا استحصال کرنا دنیا میں اللہ کے اس نظام کو چیلنج کرنے کے برابر ہی ہے جس میں اللہ انسان کو ایک دوسرے کی فی سبیل اللہ مدد کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اگر اللہ کو ایک ماننے والا اور نبی کریم کو آخری پیغمبر ماننے والا بھی صرف خدا خوفی اور خدا ترسی کے لیے ایک دوسرے مسلمان کو منافع لیے بغیر کچھ دینے پر تیار نہیں تو مسلمان اور کافر میں فرق کیا ہے۔ کافر دولت کے حصول اور اس کی بڑھوتری کے لیے بہت سارے خدا پوجتا ہے۔ مسلمان تو اللہ کی عبادت صرف اللہ کی خوشنودی اور اخروی زندگی کے لیے کرتا ہے وہ تو رزق میں کشادگی اور نعمتوں کے عطا کیے جانے کو اللہ کی عبادت کے ساتھ مشروط نہیں کرتا۔"

اسے ڈاکٹر سبط علی کی ایک ایک بات یاد تھی کیونکہ ان کے الفاظ کئی راتوں تک اس کے لیے بازگشت بنے رہے تھے۔

"جب انسان کا ایمان اللہ کی ذات پر کمزور ہوتا ہے اور اس میں توکل نہیں ہوتا تو پھر اس کا اعتقاد دنیاوی چیزوں میں بڑھ جاتا ہے۔۔۔ روپے میں۔۔۔ مال و زر میں۔۔۔ بچتوں اور جمع پونجیوں میں۔۔۔ وہ اللہ کی ذات کو باہر رکھ کر بیٹھ جاتا ہے اپنا مستقبل پلان کرنے۔۔۔ اتنا پیسہ جوڑوں گا تو اس سال یہ لوں گا۔۔۔ کسی رشتہ دار یا ضرورت مند کی مدد کر دوں گا تو پھر قرض واپس نہ ملنے پر اتنا پیسہ ڈوب جائے گا۔۔۔ اتنے سال میں گھر بنا لینا چاہیے۔۔۔ کون سے سال کون

سی گاڑی ہونی چاہیے.... بچوں کو پڑھانے کے لیے بھی پائی پائی جوڑنی ہو گی۔۔ بیٹیوں کی شادی کے لیے بھی پیسہ ہاتھ میں ہونا چاہیے.... بیماری کا علاج بھی پیسے سے ہوتا ہے۔۔ ان ساری چیزوں کے بارے میں سوچتے سوچتے انسان کو پتا ہی نہیں چلتا' وہ کب اللہ کی ذات کو پیچھے کرتے روپے کو آگے لے آتا ہے۔
روپے سے ایسا رشتہ جوڑ بیٹھتا ہے کہ اس سے علیحدگی کا تصور بھی نہیں کرپاتا۔۔ اس کی افزائش اور بڑھوتری پر خوشی سے پاگل ہوا جاتا ہے۔ اس سے اثاثے بنالینے پر اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی اور مستقبل کو محفوظ سمجھتا ہے۔۔ یہ اس پیسے کی حرص کا شیطانی اثر ہے جس سے انسان کو لگتا ہے دنیا کا سسٹم چلتا ہے.... حالانکہ دنیا کا نظام تو اللہ چلاتا ہے۔۔ وہ لمحہ بھر میں سالوں کی جمع پونجیاں خاک کردے۔۔۔ اللہ کو نظرانداز کرکے حرام کے ذریعے بنائے جانے والے اثاثوں کو انہیں کے ہاتھوں تباہ و برباد کردے۔۔ پھر انسان کیا کرے گا....؟"
وہ سارے جواب اسے آج بھی یاد تھے جنہوں نے اسے تب بے چین کیا تھا لیکن قائل نہیں' وہ مغربی تہذیب اور تعلیم جس میں اس نے ساری عمر پرورش پائی تھی وہ ترقی کو انسان کی منزل قرار دیتی ہے اور اس منزل کے حصول کے لیے قانونی اور غیر قانونی کی تفریق تو کرتی تھی.... حرام اور حلال کی نہیں.... وہ مغربی معاشرہ جو سود کے ستونوں پر کھڑا اسی کا بیج بو رہا تھا اسی کا پھل کھا رہا تھا وہ "منافع" کے اس طریقے کو جائز قرار دیتا تھا جو اخلاقیات اور انسانیت کے بنیادی اصولوں کی تذلیل اور تضحیک کرکے کھڑا کیا گیا تھا۔
"مغربی مالیاتی نظام یہود نے قائم کیا تھا اور دنیا کی معیشت کو اس مالیاتی نظام نے آکٹوپس کی طرح جکڑا ہوا ہے۔ دنیا میں مالیاتی نظام کے وہ بانی تھے اور اس کو مؤثر ترین بنانے میں قابل رشک حد تک کامیاب.... وہ سود جو بنی اسرائیل کے زوال اور اس پر آنے والے بار بار کے عذاب کی وجہ بنتا رہا تھا' وہ آج بھی نہ صرف اس سے چپکے ہوئے ہیں بلکہ اس کو مسلمان قوم کے اندر تک اس طرح پھیلا چکے ہیں کہ اب یہ سودی نظام دنیا میں کسی بھی خطے میں بسنے والے مسلمان کے خون اور خمیر میں رچنے بسنے لگا ہے.... وہ اس کو صحیح اور جائز قرار دینے کے لیے توجیہات دینے لگے ہیں اور یہ وہ امت محمدی تھی جن کے لیے قبلہ بدلا گیا تھا اور جنہیں بنی اسرائیل سے امامت لے کردی گئی تھی....."
ڈاکٹر سبط علی کی وہ سب باتیں اس کے ذہن پر تب کنکریاں برساتی تھیں تو آج ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔
"تم کیا سوچ رہے ہو سالار؟" وہ اس کی اتنی لمبی خاموشی سے پریشان ہوئے تھے۔ انہیں لگا شاید انہوں نے کوئی زیادہ سخت بات کہہ دی تھی اسے۔
"میں کیا سوچوں گا اب.... میرے ہاتھ اتنے لتھڑے ہوئے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آرہا' اب اس سب سے نکلوں کیسے؟۔۔ کیا کروں؟" اس نے جیسے اپنی مشکل ڈاکٹر صاحب کے سامنے رکھ دی۔
"آپ اللہ سے دعا کریں' وہ راستہ نکالے آپ کے لیے۔۔ اور وہ وہ راستہ ہو جو دوسروں کی زندگی سنوار دے۔"
وہ ان کی بات نہیں سمجھ پایا لیکن اس نے آمین کہا تھا۔
"نہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے کی جسارت کرنے والوں میں سے ہونا چاہتا ہوں نہ میں اللہ کی حدود توڑنے والوں میں سے۔۔ اگر اس پورے سسٹم کا حصہ بنا رہا تھا تو صرف اس لیے کہ میری خواہش تھی کہ کبھی میں کوئی ایسا سسٹم بنا سکوں جو سود پر مبنی نہ ہو اور پھر بھی قابل عمل ہو اور منافع بخش بھی.... غلطی صرف یہ کی کہ یہ خواہش رکھتے ہوئے بھی کوشش بھی نہیں کی۔۔ ضروریات زندگی اور خواہشات کا ایک ڈھیر میرے راستے میں آگیا جس نے میری ترجیحات کو بدل دیا۔۔ لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ دوبارہ آپ کے پاس سود کے حوالے سے کوئی سوال بھی نہیں لے کر آؤں گا۔۔ حل لے کر آؤں گا۔" ڈاکٹر صاحب اس کی بات پر مسکرا دیے تھے۔

"میں تمہارے لیے دعا کروں گا۔۔۔ میں اپنی زندگی کے آخری حصے میں ہوں اور اپنی ساری زندگی بے حد خواہش رکھنے کے باوجود اس سسٹم کو تبدیل کرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ بس کتابیں لکھ سکا۔ تجاویز دے سکا۔ لوگوں کو خبردار کرتا رہا۔۔۔ لیکن عملی طور پر کچھ نہیں کر سکا۔۔۔ میں نہ تمہارے جتنا ذہین تھا نہ تمہارے جتنا قابل۔۔۔ نہ تمہارے جتنا بارسوخ۔۔۔ تم شاید وہ کام کر جاؤ جس کے بارے میں ہم خواب دیکھتے سوچتے اور باتیں کرتے مرے جا رہے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب اب رنجیدہ ہو رہے تھے۔

"سود پر مبنی یہ مغربی مالیاتی نظام اس لیے طاقت ور ہے کیونکہ اس کو چلانے والے تمہارے جیسے ذہین لوگ ہیں جو اپنی ذہانت کو دنیاوی آسائشات کی خاطر انہیں ہی دیے جا رہے ہیں جس دن تمہارے جیسی ذہانت اور قابلیت رکھنے والے لوگ ان کے ساتھ کھڑے ہونے کے بجائے ان کے خلاف کھڑے ہونا شروع ہو جائیں گے تو مغرب کا مالیاتی نظام گر جائے گا صرف اس لیے کہ وہ استحصالی اور سامراجی ہے اور وہ انسان اشرف المخلوقات ہے سکے۔۔۔ نہیں طاقت ور کی بقا کے اصول پر قائم کیا گیا ہے۔ جو طاقت ور اور پیسے والا ہے' وہ کمزور اور خالی جیب والے کو جس طرح چاہے ایکسپلائٹ کرے۔۔۔ مجھے افسوس ہوتا ہے تو صرف اس لیے ہوتا ہے کہ حافظ قرآن اور صاحب حیثیت ہو کر وہ کام کرتے آرہے ہو جو کوئی مجبور ضرور تا" کرتے ہوئے بھی شاید دوبار سوچتا ہے۔"

وہ سر جھکائے اپنی ہتھیلیاں دیکھتا گم صم بیٹھا رہا۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

"آپ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟ یہ عہدہ نہ لوں؟ جاب چھوڑ دوں؟" اس نے بہت دیر بعد ان سے بس ایک سوال کیا۔

"تم اس ذہانت کا استعمال کر کے فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں عطا فرمائی ہے۔ اللہ سے پوچھو' وہ تمہارے لیے فیصلہ کرے۔"

انہوں نے فیصلہ ایک بار پھر اس پر چھوڑا تھا۔ وہ نم آنکھوں کے ساتھ ہنسا۔ کوئی بھی اس کے لیے اب فیصلہ نہیں کر رہا تھا۔ ہر ایک کو اس کی اس ذہانت پر مان تھا جو اس کے اپنے لیے ایک گمان ثابت ہوئی تھی۔

"اللہ انسان پر بہت مہربان ہے سالار۔۔۔ گناہ پر یہ نہیں کہتا کہ توبہ کا موقع نہیں دوں گا۔۔۔ بار بار توبہ کا موقعہ دیتا ہے۔۔۔ اپنی طرف پلٹ آنے کا موقع دیتا ہے۔"

وہ اب اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"زندگی میں جب انسان کو ہدایت مل جائے' وہ یہ نہ دیکھے کہ کیا کر چکا ہے۔ بس وہاں سے راستہ بدل لے۔"

وہ چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا تھا۔۔۔ وہ نرم گفتار جس کے لیے وہ مشہور تھے۔۔۔ اور جو وہ سالوں سے سنتا چلا آ رہا تھا پر آج پتا نہیں کیوں دل یہ ماننے کو تیار نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی توبہ قبول ہو جائے گی اور اتنے آرام اور آسانی سے ہو جائے گی۔۔۔

اس بات پر ایمان رکھنے کے باوجود کہ اللہ انسانوں کو معاف کرتا ہے اور اپنے بندوں کے لیے بہت رحیم ہے۔۔۔ کہیں نہ کہیں اس کے اندر یہ احساس بہت شدید تھا کہ اس نے اللہ کو خفا۔۔۔ کیا ہے۔۔۔ کس حد تک کیا ہے یہ نہیں پتا چل رہا تھا۔۔۔ وہ حافظ قرآن تھا۔۔۔ الہامی کتاب کو اپنے ذہن میں محفوظ کیے۔۔۔ اتنا الہام تو اسے بھی ہو سکتا تھا کہ اس کتاب کا خالق اس سے خوش تھا یا اس سے خفا۔۔۔ اتنا تعلق اور رابطہ تو تھا اس کا اللہ سے کہ یہ جان لے کہ "وہ" اس سے خوش نہیں۔۔۔ دیر سے ہی سہی مگر اس کی روح کے اندر موجود وہ پیمانہ اپنے خالی ہونے کا احساس دلانے لگا تھا جو اللہ کی محبت ہی سے بھرتا تھا۔۔۔ اس کی خوشنودی ہی سے چھلکتا تھا۔

وہ ڈاکٹر سبط علی کے گھر سے انہیں قدموں واپس واشنگٹن پلٹ آیا تھا۔ اسے اب اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا تھا جسے ایک لمبے عرصے سے گناہ نہیں ضرورت مانتا رہا تھا۔

ایک نیا اسلامی مالیاتی نظام بنانے کا وہ عزم جو ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹرز میں دی جانے والی ذلت کے احساس نے جنم دیا تھا' وہ اب پہلے سے زیادہ پختہ ہو گیا تھا۔۔۔ اس کا کفارہ اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی۔
واشنگٹن میں ورلڈ بینک ہیڈ کوارٹرز میں اس کے آفر قبول کرنے کے فیصلے پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے تھے ۔۔۔ وہ "پرزہ" جو انہیں اس وقت اپنی بقا کے لیے چاہیے تھا' انہیں مل گیا تھا۔
سالار سکندر نے بڑے بھاری دل کے ساتھ اس کانٹریکٹ پر سائن کیے تھے۔۔۔ اب وہ ترقی ترقی نہیں لگ رہی تھی' دلدل کی ایک اور گہرائی لگ رہی تھی۔۔۔ جس میں سے نکلنے کے لیے اسے پہلے سے زیادہ ہاتھ پاؤں مارنے تھے۔

✲ ✲ ✲

"حمین بہت خوش قسمت ثابت ہوا ہے تمہارے لیے۔"
سکندر عثمان نے اسے فون پر مبارک دیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ صرف گہرا سانس لے کر رہ گیا۔
"وہ ٹھیک ہے نا؟" سکندر عثمان نے حمین کے بارے میں اس سے پوچھا۔ وہ اس دن امامہ سے بات نہیں کر سکے تھے۔ قبل از وقت پیدائش کی وجہ سے وہ اور ان کی بیوی روز ہی اس بچے کے بارے میں دریافت کرتے تھے۔
"ہاں وہ بالکل ٹھیک ہے۔۔۔ stable ہے۔" اس نے انہیں بتایا اور تب ہی سکندر عثمان کو اسکول کا کوئی چوکیدار یاد آیا تھا جو ان سے کچھ رقم ادھار لینے آیا تھا۔
"کہہ رہا تھا سود پر کوئی رقم لی تھی اس کے ماں باپ نے اس کی بہنوں کی شادی کے لیے۔۔۔ اور وہ ابھی تک سود اتار رہا ہے۔ اب شاید کوئی اور مسئلہ آن پڑا ہے اسے۔"
سکندر عثمان اسے بتا رہے تھے اور سالار کو لگا کسی نے اس کے گلے کی رسی میں ایک گرہ اور ڈال دی تھی۔۔۔ بعض دفعہ جب اللہ کوئی چیز منہ پر مار کر تنبیہہ کرنا چاہتا ہے تو پھر ہر جگہ سے وہی بات بار بار بازگشت کی طرح واپس آتی رہتی ہے۔۔۔
اس کے پی ایچ ڈی کے لیے امریکہ چلے جانے کے بعد سکندر عثمان ہی گاؤں کے اس اسکول کو دیکھتے رہے تھے۔۔۔ وہی ہفتے میں ایک بار وہاں جاتے اور اسکول کی انتظامیہ اور ملازمین کے معاملات دیکھتے۔۔۔ سالار اب صرف نام کی حد تک اسکول کے معاملات میں انوالو تھا۔
"آپ اس کی مدد کریں۔۔۔ اس کا قرضہ اتار دیں۔۔۔" سالار نے ان سے کہا۔
"ہاں تاکہ وہاں لائن لگ جائے قرض مانگنے والوں کی۔" سکندر عثمان نے سنجیدگی سے کہا "ہمیں کیا پتا وہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ۔۔۔ ایک کا قرض اتاریں گے۔۔۔ پورا گاؤں اپنا اپنا قرض لے کر آ کھڑا ہو گا اسکول میں۔۔۔ کسی نے بھینس کے لیے لیا ہو گا' کسی نے فصل کاشت کرنے کے لیے۔۔۔ کسی نے ٹیوب ویل لگوانے کے لیے اور کسی نے بیٹی کی شادی کے لیے۔۔۔ یہاں گاؤں دیہات میں 70 فی صد لوگ سود پر ایک دوسرے سے قرضے لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی۔۔۔ یہ ان کی زندگی اور کاروبار کا سائیکل ہے۔۔۔ تم یا میں اسے روک سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں۔۔۔ ایک دفعہ تم غلام فرید کا قرض اتار دو گے۔۔۔ اگلی بار ضرورت پڑنے پر وہ پھر کسی نہ کسی سے قرض لے گا اور اسی طرح سود پر۔۔۔ وہاں کوئی کسی کو اس کے بغیر رقم ادھار نہیں دیتا۔۔۔ اور وہاں ادھار اور قرض کے بغیر لوگوں کا کام نہیں چلتا۔ اس لیے بہتر ہے ہم اور میں ان چیزوں میں نہ پڑیں۔"
سکندر عثمان نے جو توجیہہ دی تھی۔ وہ بھی غلط نہیں تھی مگر وہ یہ بات سن کر دنگ ضرور رہ گیا تھا کہ وہ وبا کہاں کہاں ناسور کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔۔۔ سکندر عثمان کو اندازہ تھا' اسے اندازہ نہیں ہوا تھا گاؤں میں اتنا آتے جاتے

رہنے کے باوجود۔۔۔

اسی رات اپنے ہوٹل میں ورلڈ بینک کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ اس کی ملاقات تھی۔ انہیں کانگو کے لیے اپنا لائحہ عمل ڈسکس کرنا تھا اور انفارمل ڈنر اور گپ شپ کے بعد وہ اس ہوٹل کے نائٹ کلب میں ان سب کے اصرار پر ایک اسپینی گلوکارہ کو سننے کے لیے گیا تھا اور وہاں جیکی اس سے آ ٹکرائی تھی۔ اس کے ساتھ پچھلے چند دنوں میں وہ سب کچھ نہ ہو چکا ہوتا تو وہ کبھی اس پر شک نہیں کرتا۔۔۔ اسے ایسی کوئی عورت سمجھتا جو تنہائی کی ماری ہوئی ہوتی یا وقتی کمپنی چاہتی تھی۔۔۔ وہ بہرحال ایسا ہوٹل اور نائٹ کلب نہیں تھا جہاں دوسرے تیسرے درجے کی stripers یا کال گرلز بافراط گاہک کی تلاش میں منڈلاتی پھرتیں۔۔۔ وہاں ایسی کوئی خواتین نظر بھی آتیں تو پہلے سے کسی کے ساتھ ہوتیں یا کسی کی دعوت پر۔۔۔ اور ایسی کسی جگہ پر اس قدر اٹریکٹو عورت کا اس پر یوں فدا اور فریفتہ ہونا اور اس کے ساتھیوں کا اس کے اطراف سے یک دم ایک ایک کر کے غائب ہونا۔۔۔ سالار نظر انداز نہیں کر سکا۔۔۔ اسے ہنسی آئی تھی۔۔۔

مغرب کو ہر فرسٹریشن کا علاج اور حل الکحل اور عورت کی شکل میں کیوں سوجھتا تھا۔۔۔ ان کی ہر ترغیب کی ابتدا اور انتہا عورت ہی کیوں ہوتی تھی۔۔۔ اور سی آئی اے کو جلدی آخر کس چیز کی تھی۔۔۔ اس کو ٹریپ کرنا تھا تو اتنا گھسا پٹا منصوبہ تو نہ بناتے۔۔۔ مستقبل میں اس کو استعمال کرنے کے لیے کوئی کمزوری چاہیے تھی تو کچھ تو انتظار کرتے۔۔۔

وہ وہاں سے اٹھ آیا تھا۔۔۔ ان ترغیبات اور حالات سے مزید خبردار ہو کر جو اس ترقی کا ثمر تھیں جن کی اس نے خواہش کی تھی۔۔۔

اور اب وہ اس جہاز پر تھا۔۔۔ اور اپنی پوری زندگی کو اپنی نظروں کے سامنے کسی فلم کی طرح چلتے دیکھتے ہوئے۔

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ بس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر حواس باختہ کیا ہو۔۔۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ تجارت بھی تو سود ہی ہے حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔"

اس نے ایک بار قرآن پاک میں سورۃ بقرہ میں پڑھا تھا۔۔۔ دوسرا جملہ تو اس کی سمجھ میں آگیا تھا لیکن پہلا جملہ وہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ آج اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

"وہ اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر حواس باختہ کیا ہو۔"

اس کیفیت میں تو وہ تھا۔۔۔ حلق پر ہاتھ پڑا تھا سالار سکندر کے۔۔۔

جہاز پر کنشاسا کے اس سفر میں اس نے یہ طے کیا تھا کہ وہ اپنی نوکری سے کمائے جانے والے پیسے سے اپنے خاندان کی کفالت نہیں کرے گا۔۔۔ اس کے لیے کسی بھی اور ذریعے سے ان کی کفالت اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔۔۔ وہ بہت سی امریکن یونیورسٹیز میں لیکچرز کے لیے مدعو ہوتا رہا تھا اور ان لیکچرز کے لیے اسے معاوضہ بھی دیا جاتا رہا تھا۔۔۔ اس سے پہلے اس نے جاب کے علاوہ ان دوسرے ذرائع کے بارے میں غور نہیں کیا تھا جہاں کام کر کے وہ اتنا رزق بخوبی کما لیتا کہ کم از کم اس اسٹیج پر اسے اس ذمہ داری کو اٹھانے میں دقت محسوس نہیں ہوتی۔

اسے اب ورلڈ بینک کی نائب صدارت صرف دو چیزوں کے لیے چاہیے تھی۔۔۔ وہ وہ قرض سر سے اتار دیتا جو ایبا کا نے اس کے لیے چھوڑا تھا اور وہ کچھ مہلت حاصل کر لیتا۔۔۔ سود سے پاک پہلے بین الاقوامی اسلامی مالیاتی ادارے کی تشکیل کے لیے۔۔۔

مقصد بہت بڑا تھا۔۔۔ وسائل بھی اتنے ہی درکار تھے۔۔۔ دماغ کہتا تھا سب کچھ ہو سکتا ہے ناممکن کچھ نہیں۔ دل کہتا تھا' بے وقوفی کے سوا کچھ نہیں اور ضمیر کہتا تھا۔۔۔ راستہ ہے تو یہی ہے۔۔۔ اور اللہ۔۔۔ زندگی میں پہلی بار جیسے اللہ نے بھی اس آزمائش کے لیے فیصلہ اس پر چھوڑ دیا تھا۔۔۔

اندر کی وہ آواز بالکل خاموش تھی جو ہمیشہ اس کی رہنمائی کرتی تھی۔۔۔ سالار سکندر کو اگر یہ وہم تھا کہ اللہ اس سے خفا تھا تو وہ صرف وہم نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کا ہاتھ پکڑے وہ اسے اب کسی راستے پر لے جانے لگا۔۔۔ ایک قدم' دوسرا قدم' تیسرا۔۔۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ ایک جھیل تھی۔ چھوٹی سی جھیل جس کے کنارے پر وہ تھے۔ ہلکی نیلی رنگت کے شفاف پانی کی ایک جھیل۔۔۔ جس کے پانی میں وہ رنگ برنگی مچھلیاں تیرتے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔

اور اس کی تہ میں بے شمار رنگوں کے موتی۔۔۔ پتھر۔۔۔ سیپیاں۔۔۔

جھیل کے پانی پر آبی پرندے تیر رہے تھے۔۔۔ خوب صورت راج ہنس جھیل کے چاروں اطراف پھول تھے۔۔۔ اور بہت سے پھول جھیل کے پانی تک چلے گئے تھے۔۔۔ کچھ پانی کی سطح پر تیر رہے تھے۔

مگر اس کے قدموں کو ان میں سے کسی چیز نے نہیں روکا تھا۔ اس کے قدموں کو روکنے والی شے جھیل کے کنارے پر موجود لکڑی کی وہ خوب صورت چھوٹی سی کشتی تھی جو پانی میں ہلکورے لے رہی تھی۔ اس نے بے اختیار کھلکھلا کر اسے دیکھا۔

"یہ میری ہے؟" وہ مسکرا دیا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بچوں کی طرح بھاگتی کشتی کی طرف گئی۔ وہ اس کے پیچھے لپکا۔ اس کے قریب پہنچنے پر کشتی پانی سے کچھ باہر آگئی۔ وہ بڑی آسانی سے اس میں سوار ہو گئی۔ اسے لگا وہ کشتی صندل کی لکڑی سے بنی تھی۔ خوشبودار صندل سے۔۔۔

وہ اس کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا کشتی کو پانی میں لے گیا۔ دونوں بے اختیار ہنسے۔

کشتی اب جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف سفر کر رہی تھی۔ اس نے جھک کر پانی میں تیرتا کنول کا پھول پکڑ لیا۔ پھر اسی احتیاط کے ساتھ اسے چھوڑ دیا۔

اس نے دوسری طرف جھک کر اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں جھیل کا پانی ایک چھوٹی سی رنگین مچھلی سمیت لیا اور اس کے سامنے کر دیا اس کے ہاتھوں کے پیالے میں حرکت کرتی مچھلی کو دیکھ کر وہ ہنسی پھر اس نے اس مچھلی کو ہاتھ سے پکڑا اور پانی میں اچھال دیا۔ وہ دونوں جھک کر اسے دیکھتے رہے۔

پانی پر تیرتا ایک ہنس کشتی کے پاس آگیا۔ پھر دوسرا' پھر تیسرا۔۔۔ وہ کشتی کے گرداب جیسے ایک دائرہ سا بنا کر تیر رہے تھے۔ یوں جیسے ان کا استقبال کر رہے تھے۔ وہ پاس سے تیر کر گزرتے' ہر ہنس کو وہ اپنے ہاتھوں سے چھوتی کھلکھلا رہی تھی۔ پھر ایک دم اس نے جھیل کے پانی پر کنول کے پھولوں کی قطاروں کو حرکت کرتے دیکھا۔ وہ جھیل کے پانی پر تیرتے اب رقص کر رہے تھے۔

ادھر سے ادھر جاتے۔۔۔ خوب صورت شکلیں بناتے۔۔۔ پاس آتے دور جاتے۔۔۔ پھر پاس آتے۔۔۔ یوں جیسے وہ یک دم ہنسوں کی طرح زندہ ہو گئے تھے۔ جھیل کے نیلے پانی پر وہ سفید کنول اپنے سبز خوب صورت پتوں کے ساتھ ہونے والی مسلسل حرکت سے پانی میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے وہ بے خود ہو رہی تھی یا بے اختیار۔۔۔ وہ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ سمجھنا اب ضروری تھا بھی نہیں۔

جھیل کے نیلے پانی پر رقص کرتے لاتعداد خوب صورت پھولوں کے بیچ اس نے یک دم کسی عکس کو نمودار ہوتے دیکھا کشتی میں بیٹھے بیٹھے وہ چونک کر مڑی اور پھر وہ بے ساختہ کھڑی ہو گئی۔ کشتی دوسرے کنارے کے پاس آ گئی تھی اور وہاں۔۔۔ وہاں کچھ تھا۔

امامہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی گہری نیند سے۔ اس نے اپنی کلائی پر کسی کا لمس محسوس کیا تھا۔ خواب آور دوا کے زیر اثر

اسے ایک لمحہ کے لیے کمرے کی مدھم روشنی میں یوں لگا وہ ایک خواب سے کسی دوسرے خواب میں آئی تھی۔ سالار اس کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھا تھا۔۔۔ بے حد قریب بستر پر دھرا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔ پتا نہیں نیند ٹوٹی تھی یا خواب۔۔۔ یا پھر وہ لمس تھا جو اسے خواب سے حقیقت میں لے آیا تھا لیکن وہ خواب اور دوا کے زیر اثر ہوتے ہوئے بھی یک دم اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے کہنیوں کے بل اٹھ کر بیٹھنے لگی تھی' سالار نے اسے روکا۔

"اٹھو مت۔۔۔"

"تم واقعی آگئے ہو؟" امامہ کو اب بھی جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

وہ دھیرے سے ہنسا۔۔۔ "تمہیں بتایا تو تھا کہ آجاؤں گا۔"

"یہ تو نہیں بتایا تھا کہ کب آؤ گے؟ اور تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟"

"بس میں نے سوچا' تمہاری نیند خراب ہو گی۔" وہ مدھم آواز میں بات کر رہا تھا۔۔۔ دوسرے بستر پر جبریل اور عنایہ تھے جو گہری نیند میں تھے اور صوفے پر ہیڈی تھی جو کچھ دیر پہلے سالار کے آنے پر دروازہ کھلنے کی آواز سے جاگ گئی تھی اور سالار کے ساتھ کچھ خیر مقدمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ کمرے سے چلی گئی تھی۔ وہ رات کے پچھلے پہر کنشاسا پہنچا تھا اور ایئرپورٹ پہ رکے بغیر وہاں آگیا تھا۔ شہر میں حالات اب نارمل ہو رہے تھے۔۔۔ فوج اور حکومت امن بحال کرنے میں کامیاب ہو رہے تھے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" امامہ نے سالار کے چہرے کو پہلی بار غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے اور آنکھیں سرخ اور یوں سُوجی ہوئی تھیں یوں جیسے وہ کئی راتوں سے سویا نہ ہو۔

"کچھ نہیں۔ بس اتنے دن گھر سے دور رہا تو شاید اس لیے کچھ۔"

سالار نے اس سے آنکھیں ملائے بغیر کہا۔ امامہ نے اس کی بات کاٹ دی' اسے یک دم اپنا خواب یاد آگیا تھا۔

"سالار! تمہیں پتا ہے' ابھی میں خواب میں کیا دیکھ رہی تھی؟" سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا؟"

"میں نے خواب میں ایک گھر دیکھا جھیل کنارے۔۔۔ جہاں تم مجھے لے کر جا رہے تھے۔۔۔ ایک کشتی میں بٹھا کر۔"

وہ دم بخود رہ گیا۔۔۔ جو گھر اس نے امریکہ میں اس کے لیے mortgage کیا تھا' وہ سمندر کے ایک جھیل نما ٹکڑے کے کنارے تھا۔۔۔ اس نے ابھی تک امامہ کو اس گھر کے بارے نہیں بتایا تھا۔ وہ اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا اس کی اگلی سالگرہ پر۔۔۔ لیکن اب وہ بیٹھے بٹھائے اسے جھیل کنارے ایک گھر کا قصہ سنا رہی تھی۔

"جس جھیل کے کنارے وہ گھر تھا وہ جھیل بے پناہ خوب صورت تھی۔۔۔ سفید کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی نیلے پانی کی جھیل۔۔۔ جس میں ہر طرف راج ہنس تیر رہے تھے۔۔۔ اور پانی میں رنگ برنگی مچھلیاں۔۔۔ اور کشتی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے خود ہی چل رہی تھی۔۔۔ اور جھیل کے کنارے پھولوں بھری جھاڑیاں تھیں۔۔۔ رنگ رنگ کے پھول سبزے کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔۔۔ اور پھول ٹوٹ ٹوٹ کر پانی پر بہتے چلے جا رہے تھے۔"

وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ جس جھیل کے کنارے اس نے گھر خریدا تھا۔۔۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی تھی۔۔۔ اس کے گرد بھی پھول تھے۔۔۔ آبی پرندے اور راج ہنس بھی۔۔۔ اور کنول کے پھول بھی۔۔۔ اور اس جھیل کے کنارے جتنے گھر تھے' ان سب کی کشتیاں بھی اس پانی میں رہتی تھیں۔ بس فرق یہ تھا کہ ان میں سے کوئی لکڑی کی چپو والی کشتی نہیں تھی جیسا نقشہ وہ کھینچ رہی تھی۔

ایک لمحہ کے لیے اسے محسوس ہوا' امامہ کو شاید اس گھر کا پتا چل گیا تھا۔۔۔ شاید اس نے اس کے لیپ ٹاپ میں

اس گھر کی تصویریں دیکھ لی تھیں... اور اب وہ جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اگر ایسا بھی تھا تو اس نے کب لیپ ٹاپ دیکھا تھا... پچھلے کئی دنوں میں تو یہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کا لیپ ٹاپ اس کے پاس تھا اور اگر یہ اس سے پہلے ہوا تھا تو پھر وہ اس وقت ان حالات میں وہ خواب کیوں سنا رہی تھی۔ وہ الجھا تھا اور بری طرح الجھا تھا۔

"اور گھر کیسا تھا؟" وہ کریدے بغیر نہیں رہ سکا۔

"شیشے کا۔" سالار کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ اس کا Mortgage کیا ہوا گھر بھی شیشے ہی کا تھا۔

"لیکن مجھے اس کے اندر کچھ نظر نہیں آیا... وہ شیشے کا تھا لیکن اندر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور میں کشتی سے اتر کر گھر کے اندر جانا چاہتی تھی تو تب ہی میری آنکھ کھل گئی۔"

وہ بہت مایوس نظر آ رہی تھی یوں جیسے اسے بہت افسوس ہو رہا تھا۔ سالار پلکیں جھپکے بغیر صرف اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"لیکن وہ گھر ویسا گھر تھا جیسا میں ہمیشہ بنانا چاہتی تھی جیسا میں اپنے اسکیچز میں اسکیچ کرتی رہتی تھی۔ وہی جھیل... وہی سبزہ... وہ شیشے کا گھر... اور ہر طرف پھول۔" وہ جیسے ابھی تک کسی خمار میں تھی۔ سالار بھی گنگ تھا۔ اس نے بھی اس گھر کو mortgage کرتے ہوئے وہی ساری چیزیں ڈھونڈی تھیں جو وہ اپنے اسکیچ میں ڈیزائن کرتی رہتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ امامہ سے کیا کہے... اگر وہ کھیل تھا تو وہ بہترین کھیل رہی تھی اور اگر وہ کھیل نہیں تھا تو اس کے دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں۔

"تم نے کبھی زندگی میں کوئی جھیل دیکھی ہے ایسی جیسی میں تمہیں بتا رہی ہوں؟" سوال اچانک آیا تھا اور عجیب و غریب تھا۔

"میں نے؟" وہ چونکا... "میں نے؟" اس نے ذہن پر زور دیا اور پھر ایک جھماکے کے ساتھ اسے یاد آیا تھا کہ اس نے وہ جھیل خواب میں دیکھی تھی... اس رات جب وہ امامہ کو گھر لے کر آیا تھا تو اس نے خواب میں خود کو کسی حسین اور خوب صورت وادی میں امامہ کے انتظار میں پایا تھا اور پھر امامہ آگئی تھی اور پھر اس وادی کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ اسے اس وادی سے ایک جھیل اور کشتی تک لے گیا تھا... اس جھیل کا نقشہ ویسا ہی تھا جیسا وہ بتا رہی تھی... پھول، سبزہ، نیلا پانی... راج ہنس... کنول کے پھول... اور لکڑی کی چپو والی صندلین کشتی...

سالار کے جسم میں کپکپاہٹ ہونے لگی تھی... وہ اگر پزل تھا تو اس کے دو ٹکڑے عجیب انداز میں جڑے تھے۔

"تم نے یہ کیوں پوچھا کہ میں نے خواب میں کبھی کوئی جھیل دیکھی ہے؟" اس نے سرسراتی آواز میں امامہ سے کہا۔

"تمہیں یاد ہے حرم پاک کے بارے میں دیکھا جانے والا وہ خواب... جس کا ایک حصہ میں نے دیکھا تھا تو ایک حصہ تم نے بھی دیکھا تھا... اور ایک ہی رات۔"

وہ اسے عجیب چیزیں یاد دلانے بیٹھ گئی تھی۔

"میں نے سوچا شاید یہ بھی ویسا ہی کوئی خواب ہو... شاید وہ گھر تم اندر سے دیکھ چکے ہو جو مجھے نظر نہیں آیا۔"

وہ بچوں جیسے اشتیاق کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی... یوں جیسے وہ کہے گا ہاں... میں اس گھر کو اندر سے دیکھ چکا ہوں... سالار کسی بت کی طرح اس کا چہرہ دیکھتا رہا... یقیناً" اس خواب کے دو ہی حصے تھے... لیکن وہ امامہ سے پچھلے حصے کا گواہ تھا... وہ اس وادی کو دیکھ چکا تھا جہاں وہ جھیل تھی پر اس جھیل کو اس نے دور سے دیکھا تھا کنارے

سے... جسے امامہ نے پار کیا تھا... اور جھیل کے پار جو گھر تھا۔ اس تک وہ دونوں ہی نہیں پہنچے تھے... اس نے گھر کی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی... امامہ نے جھلک دیکھی تھی پر اندر نہیں جھانک پائی تھی....

وہ خواب دونوں نے پہلے والے خواب کی طرح ایک رات میں نہیں دیکھا تھا۔ سالار نے وہ رخصتی کی پہلی رات امامہ کو گھر لانے پر... اور امامہ نے تقریباً" چھ سال بعد...

"اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟" امامہ کو اس کی نظریں بے حد عجیب لگیں۔

اس نے امامہ سے نظریں ہٹالیں' وہ اسے یہ نہیں بتاسکا کہ وہ کنشاسا آنے سے پہلے ڈاکٹر سبط علی سے مل کر واشنگٹن آنے کے بعد اس گھر کی mortgage کینسل کروا چکا تھا... امامہ کے خوابوں کا گھر اس کے ہاتھ سے جا چکا تھا... ایک لمحہ کے لیے بس ایک لمحے کے لیے اسے عجیب پچھتاوا اور رنج ہوا اس mortgage کی کنسلیشن پر... ایک لمحہ کے لیے اسے یہ خیال بھی آیا تھا کہ وہ اس گھر کو واپس حاصل کر لے فوری طور پر امریکہ بات کر کے... وہ اس وقت جس پوزیشن میں تھا۔ یہ کر سکتا تھا... مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے ذہن کو جھٹکا تھا... یہ صرف سی آئی اے نہیں تھی جو اس کے لیے جال بچھا رہی تھی... شیطان بھی وہیں تھا... "اس کے بندوں" کو اپنے بندوں میں بدلنے کے لیے کمربستہ۔ جال سی آئی اے نے عورت کا پھینکا تھا تو شیطان نے گھر کا... زن... زر... زمین... انسان ان تین چیزوں سے سردار بنتا ہے اور انہیں چیزوں سے "سر" دار تک جاتے ہیں۔

سالار سکندر سی آئی اے کو اعوذباللہ من الشیطن الرجیم کہہ کر جو تا مار آیا تھا تو یہ کیسے ممکن تھا' شیطان خود اٹھ کر سامنے نہ کھڑا ہوتا۔ اس سے بڑی ترغیب... بڑی گمراہی... بڑا لالچ... بڑا پھندا ایک بار قدم ڈگمگائے تو... ایک بار وہ ہاتھ آئے تو... اور شیطان کے منہ پر لعنت بھیج کر' تھوک کر آنے والا جس کی پناہ اور حفاظت کا دعوا کر کے آیا تھا... یہ کیسے ممکن تھا' وہ رب اپنے بندے کی حفاظت کے لیے وہاں نہ ہوتا... وہ حافظ قرآن تھا۔ گناہ پر اس کے لیے سزا زیادہ تھی تو اچھائی پر اس کے لیے انعام بھی بے پناہ...

"حمین کیسا ہے؟" وہ یک دم بات وہیں کی وہیں چھوڑ کر حمین کے انکیوبیٹر کی طرف آیا تھا۔ شیطان نے افسوس سے ہاتھ ملے... وہ بات چھوڑ کر کیسے اٹھ کھڑا ہوا تھا... وہ برق کی طرح آیا تھا اور پل بھر میں غائب ہوا... بس وسوسہ اور وہم ڈالتا تھا... وہ ڈال گیا تھا۔

"بالکل ٹھیک ہے... دیکھو' سو رہا ہے۔" امامہ نے وہیں تکیے سے ٹیک لگائے کہا۔

سالار نے انکیوبیٹر کو کھول کر پہلی بار محمد حمین سالار کو گود میں لیا تھا... ساری میڈیکل احتیاطوں کی نفی کرتے ہوئے اس نے نم آنکھوں کے ساتھ اسے جھکتے جھکتے سینے سے لگایا اور چوما... وہ کمزور بچہ باپ کے لمس پر کسمسایا پھر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں... سیاہ... موٹی... گول آنکھیں جو اس نحیف و نزار وجود پر عجیب و غریب لگ رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھولتے ہی باپ کو دیکھا تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر وہ اسے دیکھتا رہا... سالار بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے اسے دیکھتا رہا... پھر اس کے ماتھے پر چند بل آئے تھے... ناک اوپر چڑھی... اور پھر حمین نے پوری قوت سے گلا پھاڑ کر رونا شروع کر دیا تھا... اس کی آواز اتنی باریک اور اتنی تیز تھی کہ چند لمحوں کے لیے سالار ہکا بکا رہ گیا تھا کہ اس کے ننھے وجود کے اندر اس طرح گلا پھاڑ کر رونے کے لیے جان کہاں سے آئی تھی... جبریل اور عنایہ اس کی آواز پر بے اختیار ہڑبڑا کر اٹھے تھے... حمین جب بھی روتا تھا اسی طرح اچانک اور اسی والیم پر روتا تھا۔

پیڈی یک دم اندر آگئی تھی۔ سالار حمین کو واپس انکیوبیٹر میں رکھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا لیکن وہ ایک ہفتہ کا بچہ ایک بار انکیوبیٹر سے نکلنے کے بعد دوبارہ اندر نہ جانے کے لیے جس حد تک جدوجہد کر سکتا تھا کر رہا تھا اس کا اگر بس چلتا تو وہ اپنے ہاتھوں کی پشت' سینے' ناک اور جسم کے ہر حصے پر لگی نالیوں اور تاروں کو کھینچ کر اتار دیتا

۔وہ ان میں سے کسی چیز کو تو نہیں اتار سکا مگر وہ ہلکا سا ڈائپر اس کے جسم کے مسلسل جھٹکوں سے یک دم کھل گیا تھا جو ۔۔۔ صرف رسما" ہی اسے باندھا گیا تھا۔۔۔

ڈائپر کے علاوہ حمین کے جسم پر جگہ جگہ لگائی تاروں اور نلکیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔وہ یکدم ہی تارزن کے بچے جیسے حلیے میں آگیا تھا۔ بستر سے چھلانگ لگا کر باپ کی طرف بھاگتے جبریل نے اپنے چھوٹے بھائی کے اس "دلیرانہ" اقدام پر بے اختیار چیخ مار کر آنکھوں پر ہاتھ رکھا تھا۔۔۔

"baba baby is naked"

(بابا بے بی ننگا ہے۔۔۔) اس نے جیسے بے یقینی سے آنکھوں کی ہتھیلیوں سے ڈھانپے اعلان کیا۔

وہ آنکھیں بند نہ کرلیتا تو بے شرمی کے اگلے مظاہرے پر یقیناً" پتھر کا ہو جاتا کیونکہ بے بی اسی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کر روتے ہوئے ڈائپر سے نجات حاصل کرنے کے بعد اب اس پانی سے بھی فراغت حاصل کر رہا تھا جو ٹیوبز کے ذریعے اس کے اندر منتقل کیا جا رہا تھا۔۔۔ ہیڈی کو حمین کو تھماتے ہوئے سالار بے یقینی سے اپنی پیشاب سے بھیگی ہوئی شرٹ کو دیکھ رہا تھا۔۔۔ یہ کارنامہ اس کے پہلے دو بچے کبھی نہیں کر سکے تھے۔

"تم نے پتا نہیں اسے کیسے پکڑا ہے۔۔۔ کتنے سخت ہاتھ لگائے ہیں کہ وہ اس طرح رو رہا ہے۔۔۔ ہیڈی لیڈی ڈاکٹر کو بلاؤ۔۔۔ بلکہ اسے مجھے دو۔۔۔ نہیں میں آتی ہوں۔"

امامہ اس کی حالت کو مکمل طور پر نظر انداز کیے اپنے روتے ہوئے بیٹے کی طرف متوجہ اپنے بستر سے بے قراری کے عالم میں اتر رہی تھی۔

"Baba can I open my eyes "

(بابا! میں اپنی آنکھیں کھول لوں)

جبریل اندھوں کی طرح ہاتھ پھیلائے باپ کو ڈھونڈتے لڑکھڑاتے قدموں سے آنکھیں بند کیے سالار کی طرف آ رہا تھا وہ اس چھوٹے بھائی کی بے پردگی دیکھنے پر تیار نہیں تھا جو اس وقت لٹل اسٹوارٹ کی طرح چلاتے ہوئے انکیوبیٹر سے باہر کودنے کو تیار تھا۔

عنایہ ایک بار ہڑبڑا کر جاگنے کے بعد سالار کی طرف متوجہ ہوئے بغیر دوبارہ سو چکی تھی۔۔۔ سالار نے جبریل کے پھیلے ہاتھوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہمیشہ کی طرح زمین پر پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے۔۔۔ یہ وہ زندگی اور دنیا تھی جو اس کے ہاتھ سے پھسلتے پھسلتے رہ گئی تھی۔۔۔ اس کی انگلیوں کی پوروں تک جا کر واپس پلٹی تھی یہ زندگی۔۔۔ یہ آوازیں ۔۔۔ اس کا خاندان۔۔۔ وہ کمرہ اس میں موجود وہ ننھے منے وجود جو اس کے وجود کی تکمیل کرتے تھے۔

"Yes you can-"

اس نے اسی طرح جبریل کو خود سے لپٹائے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ جبریل نے آنکھیں کھول کر سب سے پہلے چور نظروں سے حفظ ماتقدم کے طور پر انکیوبیٹر کو دیکھا جہاں اب حمین ہیڈی اور امامہ کے وجود کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

"why are you crying papa-"

(بابا! آپ کیوں رو رہے ہیں؟)

باپ کی طرف متوجہ ہوتے ہی اس نے پہلی نظر میں ہی اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے اور اس کے جملے نے امامہ کو بھی پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

سالار کی پشت اب اس کی طرف تھی اور وہ جبریل کو لپٹائے چومے جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

گھر مکمل طور پر جل گیا تھا۔۔۔ نقصان کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ مگر یہ ورلڈ بینک کی طرف سے فراہم کی جانے والی رہائش گاہ تھی۔ اس لیے اس کا نقصان پورا ہو جانے والا تھا۔۔۔ سالار کنشاسا پہنچنے کے اگلے ہی دن اس گھر کو دیکھنے آیا تھا جہاں وہ رہائش پذیر تھے۔۔۔ وہاں سب ہی گھروں کو ہی آگ لگائی گئی تھی لوٹ مار کے بعد۔۔۔ اب وہاں جو بچا تھا' وہ ملبہ اور راکھ تھی۔۔۔ وہ پھر بھی خوش نصیبوں میں تھا کیونکہ اس ملبے میں اس کے کسی پیارے کی ہڈیاں نہیں تھیں۔

یہ سالار سکندر کے ساتھ دوسری بار ہوا تھا۔۔۔ پہلی بار اس نے گاؤں میں اپنے اسکول کی عمارت کو یوں خاکستر ہوتے دیکھا تھا۔۔۔ اس گھر کے ملبے کو دیکھتے ہوئے اس نے جو سوچا تھا' وہ اسکول کی راکھ کو دیکھ کر نہیں سوچا تھا تب اس نے امامہ کی فیملی کو ہر نقصان کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا اور کہیں بھی اس نے یہ نہیں سمجھا یا سوچا تھا کہ یہ اس کے اپنے کسی عمل کی سزا تھی۔ کوئی تنبیہہ تھی جو اسے کی جا رہی تھی۔ وہ سود سے کمائے جانے والے پیسے سے فلاح عامہ کا کام کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ اسے قبول کرتا۔۔۔ آج ایک بار پھر وہ ایسے ہی ایک ملبے کے سامنے کھڑا ہوا یہ سمجھ پا رہا تھا کہ وہ اس کا رزق تھا جس سے صرف شر نکل رہا تھا۔ خیر نہیں۔

گھر کو لگنے والی آگ میں وہ چھوٹی موٹی ساری جیولری' سیونگ سرٹیفکیٹس اور اس کے بچوں کی انشورنس کے پیپرز راکھ ہو گئے تھے یا لوٹ لیے گئے تھے۔۔۔

امامہ کو شادی میں سالار کی فیملی کی طرف سے ملنے والا زیور پاکستان میں ہی ایک لاکر میں تھا یہاں امامہ کے پاس صرف وہ چھوٹی موٹی ڈائمنڈز کی جیولری تھی جو وہ وقتاً" فوقتاً" افریقہ یا امریکہ میں خریدتی رہی تھی لیکن اس چھوٹی موٹی جیولری کی قیمت بھی چالیس لاکھ سے کم نہیں تھی۔۔۔ اس گھر میں اور بھی بہت کچھ چلا گیا تھا جس کا امامہ کو صدمہ تھا لیکن سالار کو نہیں تھا۔۔۔ اس کے لیے یہ کافی تھا کہ اس کا خاندان سلامت تھا۔

ورلڈ بینک نے اپنے تمام ملازمین کے نقصانات کو پورا کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا اور یہ کام ہنگامی بنیادوں پر
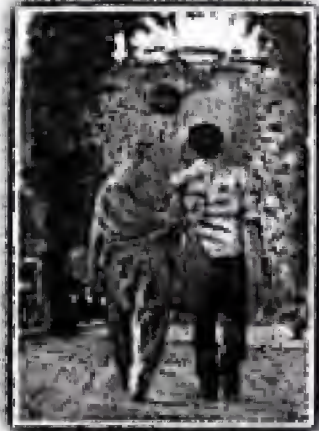
ہو رہا تھا۔ تمام ملازمین کو اپنے کلیمز داخل کرنے کے لیے کہا گیا تھا لیکن سالار سکندر نے کوئی کلیم داخل نہیں کیا تھا۔۔ اسے اب اس پیسے سے خوف آرہا تھا جو جب بھی اس کے پاس آتا۔ اس کی حلال کمائی کو بھی اپنے ساتھ خس و خاشاک کر دیتا۔

وہ ایمبیسی سے ایک فائیو سٹار ہوٹل میں منتقل ہو گئے تھے۔ حمین امریکن ایمبیسی کے ہی اس اسپتال میں رہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں جب ڈاکٹرز حمین کو سفر کے قابل قرار دیں تو تم بچوں کو لے کر پاکستان چلی جاؤ۔"

سالار نے ایک رات امامہ سے کہا تھا۔ وہ اس دن کچھ بنیادی ضروریات کی چیزیں خرید کر لائی تھی ہوٹل کے اس سوئیٹ کے لیے۔ جو اب وقتی طور پر ورلڈ بینک کی طرف سے سالار سکندر کی رہائش گاہ بھی تھا اور آفس بھی۔۔۔۔

وہ ایک گھن چکر کی طرح پورے کانگو میں ایک بگولے کی طرح گھومتا پھر رہا تھا ورلڈ بینک اور یونائیٹڈ نیشنز کے امن پیغامبروں کے ساتھ۔۔۔ کام کے دوران دن اور رات کی تمیز اس نے پہلے بھی کبھی نہیں کی تھی لیکن اب تو یہ فرق بالکل ہی مٹ گیا تھا۔ اور اس ساری بھاگ دوڑ میں اسے امامہ سے بات کرنے کا خیال آیا بھی تھا تو صرف اسی ایک بات کے لیے۔۔۔۔

"کیوں؟" وہ ناخوش ہوئی تھی۔

"کیونکہ جو کچھ کانگو میں ہو چکا ہے، میں اب تم لوگوں کے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا۔"

امامہ کچھ دیر پہلے اس کے لیے کافی بنا کر لائی تھی۔۔۔ کئی دنوں بعد انہیں رات کے اس پہر آپس میں بات کرنے کا موقع ملا تھا۔۔۔ حمین اسپتال سے ڈسچارج ہونے والا تھا اور سالار جیسے ان کو واپس بھیجنے کے لیے گھڑیاں گن رہا تھا۔

"کانگو اتنا غیر محفوظ ہے تو تم یہاں کیوں رہنا چاہتے ہو۔ تم بھی واپس چلو۔" امامہ نے۔۔۔ جواباً "کہا۔

وہ گہرا سانس لے کر رہ گیا "میں فی الحال نہیں جا سکتا۔" اس نے ایک گھونٹ لیا۔

"فی الحال؟" امامہ نے جواباً "پوچھا۔

"اگلے پانچ سال۔"

"ہرگز نہیں۔۔۔"

امامہ نے کافی کا کپ اسی طرح رکھ دیا۔ مزید کسی سوال جواب کے بغیر اس نے جیسے فیصلہ سنا دیا تھا۔

"تمہاری ضد مجھے کمزور کرے گی!۔۔۔ تم اور بچے یہاں رہیں گے تو میں بہت پریشان رہوں گا"اپنے کام پر دھیان نہیں دے پاؤں گا۔ تم لوگ محفوظ۔" امامہ نے اس کی بات کاٹ دی

"تمہیں لگتا ہے ہم یہاں کانگو میں بیٹھے رہو گے تو میں اور بچے پاکستان میں عیش کریں گے۔ تم اپنے سکون کے لیے مجھے بے سکون کرنا چاہتے ہو؟ میں نہیں جاؤں گی سالار۔۔۔ مجھے وہیں رہنا ہے جہاں تم رہو گے۔۔۔ میں کسی بنکر میں چھپوں گی نہ بچے چھپیں گے۔۔۔ اگر یہاں خطرہ آئے تو پھر سب کے لیے آئے اور اگر تحفظ ہو تو بھی سب کے لیے۔۔۔"

وہ اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا تھا وہ اس کے ہر لہجے سے واقف تھا اور جانتا تھا وہ اس ضد سے نہیں ہٹے گی۔

ڈاکٹر سبط علی نے کہا تھا "اسے امامہ سے جو تکلیف ملی تھی۔ وہ اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھا لیکن وہ ان سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے اس کے ساتھ میں جو سکون ملتا تھا۔ وہ کس نیکی کا صلہ تھا۔

"تم کچھ کرنا چاہ رہے ہو جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔۔۔ لیکن تم چھپا نہیں سکو گے۔۔۔ میں جان جاؤں گی۔۔۔ تم بتاؤ

نہ بتاؤ۔"

وہ اب شکی بیویوں کی طرح اسے کرید رہی تھی اور ساتھ جیسے خبردار بھی کر رہی تھی۔ وہ اس سے کہہ نہیں سکا کہ اس میں ابھی اتنا حوصلہ پیدا نہیں ہو رہا کہ وہ اس کے سامنے وہ اعترافات کرے جو وہ ڈاکٹر سبط علی کے سامنے کر کے آیا تھا اور پھر اسے بتائے کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ اسے ناکامی کا اندیشہ تھا اور ناکامی کا خوف بھی۔

"کچھ نہیں۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ جنگلوں میں مارا مارا پھر رہا ہوں پیٹرس ایباکا کے ساتھیوں سے ملنے اور مذاکرات کرنے۔" سالار نے بات ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"ایک مہینے تک پھر بھی پاکستان چلیں گے۔"

"تم چلو گے؟" امامہ نے بیچ میں ہی بات کاٹ کر پوچھا تھا یوں جیسے اسے اندیشہ ہوا تھا کہ وہ اب بہانے سے اسے پاکستان واپس بھیجنا چاہتا تھا۔

"ہاں۔ چلوں گا یار۔ اتنی بے اعتباری بھی ٹھیک نہیں ہوتی۔"

اس نے جیسے بُرا مانتے ہوئے کافی کا آخری گھونٹ لے کر کپ رکھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ورلڈ بینک اور امریکی حکومت نے اگر واشنگٹن میں سالار سکندر کے ساتھ مذاکرات میں اسے فری ہینڈ کی ضمانت دی تھی تو انہوں نے یہ وعدہ پورا کیا تھا۔ انہوں نے سالار سکندر کو افریقہ کے سیاہ و سفید کا مالک بنا کر وہاں بھیجا تھا۔ وہ ورلڈ بینک کے مختلف خطوں کے لیے مخصوص وائس پریذیڈنٹس میں سے پہلا اور واحد وائس پریذیڈنٹ تھا جس کے پاس کام کرنے کی اتنی آزادی اور اختیارات تھے اور جس سے ورلڈ بینک کا بورڈ آف گورنرز ہی نہیں امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ بھی وقتی طور پر دب رہا تھا۔ سالار سکندر ان کا وہ پیادہ تھا جو بیٹھے بٹھائے پیادے سے بادشاہ بن گیا تھا اور اس چیس بورڈ پر موجود تمام اہم مہروں کو یک دم اس کو بادشاہ کی حیثیت دینی پڑ رہی تھی۔

واشنگٹن میں ورلڈ بینک کی نائب صدارت قبول کرنے کے اگلے دن اس نے کنشاسا جانے سے پہلے پہلی بار واشنگٹن میں اہم ترین نیوز چینلز کے نمائندوں کے ساتھ پریس کانفرنس کی۔ وہ پیٹرس ایباکا کی موت کے بعد اس کی پہلی رسمی بات چیت تھی جس میں اس نے کانگو میں 'ورلڈ بینک کے اس پروجیکٹ کے حوالے سے ماضی میں ہونے والی زیادتیوں کا ازالہ کرنے کی یقین دہانی کراتے ہوئے ورلڈ بینک پر کی جانے والی تنقید کو کھلے دل سے تسلیم کیا تھا۔ اس نے بینک کا دفاع نہیں کیا تھا۔

اس کے ساتھ ایک دن پہلے ہونے والے مذاکرات میں ورلڈ بینک اور امریکی انتظامیہ نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ نائب صدر کے طور پر ورلڈ بینک کی پالیسیوں کا دفاع کرتے ہوئے ورلڈ بینک کی صفائی پیش کرے اور وہاں یہ نہ بتائے کہ ورلڈ بینک نے اس کی رپورٹ ابتدائی اسٹیج پر رد کر دی تھی اور اسے استعفیٰ دینے کا کہہ دیا تھا مگر سالار سکندر نے ورلڈ بینک کی افریقہ میں نافذ العمل کسی بھی پالیسی کے دفاع سے انکار کر دیا تھا۔ ہاں وہ اس بات پر رضامند ضرور ہو گیا تھا کہ وہ اپنی رپورٹ کو رد کرنے کے حوالے سے ورلڈ بینک کی انتظامیہ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرائے گا اور صرف یہی کہے گا کہ ورلڈ بینک کی انتظامیہ نے اس کی رپورٹ کے مندرجات کو دیر سے پڑھا اور پھر اس پر ایکشن لیا۔

ورلڈ بینک کی انتظامیہ اس پر نیم دلی سے رضامند ہو گئی لیکن ان کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ کچھ نیوز چینلز نے ورلڈ بینک کے کانگو آفس کے کسی ملازم کے ذریعے ان ای میلز کا ریکارڈ اپنے پروگرامز میں پیش کر دیا جن میں کئی مہینے پہلے ورلڈ بینک نے سالار سکندر کی اس رپورٹ کے حوالے سے اس کے خلاف سخت ایکشن لینے اور تادیبی

کارروائی کی دھمکی دیتے ہوئے اسے استعفیٰ دینے کے لیے کہا تھا۔ یہ ورلڈ بینک کے لیے ایک اور جھٹکا تھا اور سالار سکندر کی ساکھ کو بڑھانے میں معاون ایک اور اہم پیش رفت۔
سالار سکندر کی پریس کانفرنس ورلڈ بینک کی انتظامیہ کے لیے کھسیاہٹ کا باعث ہونے کے باوجود صرف اس لیے حوصلہ افزا تھی کیونکہ اس میں سالار سکندر نے افریقہ کے بدترین معاشی اور معاشرتی حالات میں ورلڈ بینک سے ہونے والی غلطیوں کے باوجود اس کی وہاں ضرورت اور کردار کی اہمیت پر زور دیا تھا' خاص طور پر دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں۔
اس کی اس پہلی پریس کانفرنس کی اہم باتیں افریقہ کے بڑے بڑے اخبارات نے اگلے دن ہیڈلائنز کے طور پر لگائی تھیں۔ کانگو کے عوام کے لیے سالار سکندر کا چہرہ استحصالی سامراج کا چہرہ نہیں تھا ان کے لیے وہ پیٹرس ایباکا کے ایک قریبی اور قابل اعتماد ساتھی کا چہرہ تھا' جو ان میں سے نہ ہونے کے باوجود ان کے لیے درد رکھتا تھا۔ اور کیوں رکھتا تھا؟ اس کا جواب اس نے پیٹرس ایباکا کی آخری رسومات میں شریک افریقہ کے لاکھوں عوام کے مجمع کے سامنے پیٹرس ایباکا کی زندگی اور اس کی خدمات کے لیے پیش کیے جانے والے خراج تحسین میں دیا تھا۔
وہ کانگو میں آنے کے بعد' پیٹرس ایباکا کی میت واپس آنے سے پہلے کانگو کے طول و عرض میں ہر اس قبائلی لیڈر سے ملا تھا جو پیٹرس ایباکا کا ساتھی تھا اور جو قبائلیوں میں تھوڑا بہت اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ پیٹرس ایباکا کے خاندان نے اس کی موت کے بعد کسی بھی غیر ملکی ادارے یا حکومت کے نمائندوں سے ملنے سے انکار کر دیا تھا لیکن سالار سکندر کی ملاقات کی درخواست کو انہوں نے رد نہیں کیا تھا۔ وہ اس سے بے حد خوش دلی اور احسان مندی سے ملے تھے۔ سالار سکندر نے پیٹرس ایباکا کی آخری ای میل انہیں دی تھی جو اس نے سالار کو کی تھی۔ اس ای میل کا پرنٹ آؤٹ اگلے دن بڑے بڑے مقامی اخبارات میں شائع ہوا تھا۔
افریقہ اب پیٹرس ایباکا کے جسد خاکی کے استقبال اور اس کی تدفین کی تیاریاں کر رہا تھا اور سالار سکندر صرف ایک کوشش کہ وہاں متوقع لاکھوں کا مجمع ایک بار پھر سے اس طرح مشتعل ہو کر غیر ملکی سفارت خانوں اور اداروں اور غیر ملکیوں پر حملہ نہ کر دے۔
امریکی حکومت ابتدائی طور پر اس کی میت کو واپس بھیجنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ امریکی شہریت بھی رکھتا تھا اور وہ اس کی میت کی قانونا" مقامی طور پر تدفین کر سکتے تھے کیونکہ انہیں یہی خدشہ تھا کہ پیٹرس کی تدفین کے لیے اکٹھا ہونے والا مجمع ایک بار پھر سے کانگو میں قتل و غارت کا بازار گرم کر سکتا تھا۔ کانگو کی حکومت بھی عوامی دباؤ کے باوجود ایباکا کی میت واپس لینے سے انکاری تھی مگر یہ سالار سکندر کے ساتھ ملاقات میں ایباکا کی فیملی کا دباؤ اور اصرار تھا کہ وہ ایباکا کی میت کی واپسی ممکن بنائے اور وہ اس بات کی گارنٹی دینے پر تیار تھے کہ ایباکا کی تدفین پرامن ہوگی۔
سالار سکندر نے ورلڈ بینک کی انتظامیہ کے ذریعے امریکی حکومت کو یہ بات باور کرائی تھی کہ ایباکا کی لاش کی باعزت واپسی کانگو اور افریقی عوام کے دلوں میں اس غصے کو ختم کرنے میں معاون ثابت ہوگی جو اس کے مردہ جسم کو امریکہ زبردستی وہیں رکھ کر بڑھا رہا تھا۔ امریکی حکومت' اس کے کانگو واپسی کے دو ہفتے بعد ایباکا کی میت واپس بھیجنے پر تیار ہو گئی تھی۔
کانگو کی حکومت نے غیر ملکی حکومتوں کے ان نمائندوں سے جو تدفین میں شریک ہونا چاہتے تھے معذرت کر لی تھی کہ وہ ایباکا کی تدفین میں شریک ہونے والے لاکھوں افراد کے متوقع ہجوم میں نہ تو انہیں تحفظ فراہم کر سکتے ہیں نہ ان کی حفاظت کی ضمانت۔ ورلڈ بینک کی انتظامیہ اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے سالار سکندر کو بھی ایباکا کی آخری رسومات میں شریک ہونے سے روکا تھا جس کے لیے اسے ایباکا کی فیملی نے مدعو کیا تھا اور سالار نے اس دعوت

نامے کو قبول کرلیا تھا۔
امامہ بھی اس کے اس فیصلے سے ناخوش اور خوف زدہ تھی اور اس نے اسے سمجھانے اور روکنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ وہ اس وقت تک یہ کوشش کرتی رہی تھی جب تک ایباکا کی لاش کنشاسا پہنچ گئی اور اسی شام اس کی تدفین کے انتظامات ہو رہے تھے۔
سالار سکندر اس کی اس منت سماجت کے دوران ایئرپورٹ جانے سے پہلے دو نفل پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا اور وہ بے بسی سے بچوں کو لیے بیٹھ گئی تھی۔
"اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم بچوں کو لے کر فوری طور پر پاکستان چلی جانا۔ اس انتظار میں مت بیٹھی رہنا کہ میری ڈیڈ باڈی مل جائے۔"
اس نے نفل پڑھنے کے بعد پہلا جملہ اس سے یہی کہا تھا۔ وہ اس وقت اپنے بیڈ روم میں تھا۔ بچے سویٹ کے دوسرے کمرے میں تھے اور امامہ ان کے پاس سے اٹھ کر اسے سمجھانے آئی تھی اور اس کی نماز ختم ہونے کے انتظار میں بیٹھی تھی اور اس نے جاء نماز تہہ کرتے ہوئے۔ بڑے اطمینان کے ساتھ یہ کہا تھا۔
امامہ کے دل پر چوٹ پڑی۔ "تم بہت بے رحم ہو" اس نے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے سالار سے کہا۔
"تم سے کم۔" سالار نے ہنستے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔
پھر وہ دوسرے کمرے میں اپنے بچوں سے ملنے آیا تھا۔ جبریل باپ کے ساتھ ہی دروازے تک چلا آیا۔

دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے امامہ کو خدا حافظ کہا تو اس نے اس کا بازو پکڑ لیا۔
"تم واپس آجاؤ گے نا؟" وہ برستی آنکھوں سے منت بھرے انداز میں اس سے کہہ رہی تھی۔ یوں جیسے وہ اس کی بات نہیں ٹالے گا۔ یا شاید رک ہی جائے۔
اس نے امامہ سے نظریں ملائے بغیر اپنے بازو سے اس کا ہاتھ اٹھا کر اسے نرمی سے چوما اور کہا "ان شاء اللہ" پھر جھک کر اپنی ٹانگ سے چپکے جبریل کو اٹھاتے ہوئے اس کا منہ چوما اور کہا "اپنی ممی اور بہن بھائی کا خیال رکھنا۔"
" I Always do baba "جبریل نے اسے یقین دلایا۔
(بابا! میں ہمیشہ رکھتا ہی ہوں۔)
سالار نے ایک بار پھر اس کا منہ چوما اور اسے کہا۔ "آئی پراؤڈ آف یو۔"
سالار نے اسے گود سے اتار دیا اور سب کو خدا حافظ کہا۔ دروازے میں برستی آنکھوں کے ساتھ کھڑی امامہ کو دیکھے بغیر۔

☼ ☼ ☼

لاکھوں لوگوں کے ہجوم کے ساتھ 'سالار سکندر نے ایئرپورٹ پر ایباکا کی میت کو وصول کیا تھا۔ ان لاکھوں لوگوں کے ہجوم میں سالار سکندر کے علاوہ ایک بھی سفید فام نہیں تھا یہاں تک کہ اس دن کانگو میں اس ایونٹ کو کور کرنے والے نیوز چینلز کا سارا عملہ بھی مقامی تھا۔ کوئی ہتھیاروں سے مسلح اس قبائلی ہجوم میں جانے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا جن کو جان لینے اور جان دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا تھا۔ جو وحشی اور اجڈ تھے اور اپنی بقا کے لیے ہر اس چیز کو خس و خاشاک بنا دینے پر تیار 'جو ان کے راستے میں دیوار بنتی۔
اور لاکھوں سیاہ فام لوگوں کے ہجوم میں "ایک صاف رنگت والا سفید فام تھا جو نسلی طور پر سفید فام نہ ہونے کے

باوجود اپنی صاف رنگت اور ان لوگوں کی سیاہ ترین رنگت کے مقابلے میں 'سفید فام' لگ رہا تھا۔ وہ وہاں نہتا تھا۔ کانگو کی حکومت نے اسے کچھ سیکیورٹی دی تھی مگر اس سیکیورٹی کو ان قبائلیوں نے رد کردیا تھا جو اس سارے ایونٹ کے انتظامات سنبھالے ہوئے تھے۔ اور سالار سکندر تن تنہا اسی دلیری سے اپنے ساتھ ایک بھی گارڈ لیے بغیر اندر چلا گیا تھا۔

دنیا میں کروڑوں TV اسکرینز پر لائیو نشر ہونے والا وہ ایونٹ لاکھوں کے اس ہجوم میں صرف ایک شخص کو فوکس کیے ہوئے تھا۔ اور بار بار۔ تیکھے نقوش والا وہ دراز قامت شخص ایباکا کی آخری رسومات کے موقع پر اسٹیج پر اس کے خاندان کے ساتھ اس مجمع کے سامنے بیٹھا تھا جس میں سے کوئی بھی اس پر گولی چلاتا تو یہ بھی پہچانا نہیں جاسکتا تھا کہ وہ کہاں تھا اور کون تھا؟

اور اگر وہ مجمع اس پر چڑھ دوڑتا تو اللہ کے سوا کوئی نہیں تھا جو اس مجمع کے ہاتھوں اس کی بوٹیوں کے بھی ٹکڑے ہونے سے روک سکتا۔ اور یہ احساس سالار سکندر کو اس اسٹیج پر ان لاکھوں لوگوں کے سامنے بیٹھے پر ہو رہا تھا۔ جو ایباکا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کی جانے والی قبائلی سرداروں کی جوشیلی تقریروں میں اس سامراج کی تباہی کے لیے نعرے بلند کررہے تھے جن کا ساتھی بن کر وہ وہاں بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل پر لاکھوں لوگوں کی ہیبت طاری ہو رہی تھی اور اس کی زبان پر قرآنی آیات کا ورد تھا۔

یہ احساس ہونے کے باوجود کہ اللہ اس سے خفا تھا وہ اللہ ہی کو پکار رہا تھا۔

امریکہ میں سی آئی اے ہیڈ کوارٹر اور ورلڈ بینک کے ہیڈ کوارٹر میں اسکرین پر نظر آنے والا وہ شخص ان سب کو اپنی ہیبت میں لے رہا تھا جن کا ڈنکا پوری دنیا میں بجتا تھا۔ دلیری ہو تو ایسی ہو۔ جرأت ہو تو یہ۔

وہ گنگ تھے۔ دم بخود تھے۔ اور مرعوب۔

وہ شخص اب پیٹرس ایباکا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے اپنی نشست سے اپنا نام پکارے جانے پر اٹھ رہا تھا۔ لاکھوں کا مجمع اس کے لیے جواباً" تالیاں بجا کر داد تحسین دے رہا تھا۔

چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد۔ تیکھے نقوش اور سنجیدہ چہرہ۔ سیاہ ٹو پیس سوٹ میں وہ وجاہت اور وقار کی ایک خوب صورت مثال تھا۔ جو اس وقت پوری دنیا کے کیمروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس اسٹیج کے بالکل اوپر کافی بلندی پر ایک بلیک ہاک ہیلی کاپٹر میں سی آئی اے کے کچھ کمانڈوز۔ اس مجمع کو ٹی وی اسکوپس سے مانیٹر رہے تھے۔ چند اور بلیک ہاکس آس پاس کی عمارتوں کو۔ وہ سالار سکندر کی حفاظت اور زندگی کے لیے اس وقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتے تھے۔

سالار سکندر روسٹرم کے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ اب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کے بعد قرآنی آیات کی تلاوت کر رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)